احسان اکبر کی نظم کا فکری اور فنی سراپا

ارشد محمود ناشاد*

ڈاکٹر احسان اکبر کی متعدد تخلیقی اور شعری جہات ہیں اور ہر جہت دامنِ کش دل ہے مگر اُن کی نظم اپنے فکری پھیلاؤ، عمق، خوش رنگ لفظیات، غنائی تاثر اور فنّی رکھ رکھاؤ کے باعث اُن کی دوسری تخلیقات سے زیادہ دل کش اور جاذبِ نگاہ ٹھہرتی ہے۔ اُن کا فکری وفور اور فنی جوہر نظم کی تشکیل اور بافت میں جس طرح صَرف ہوا ہے، اس نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو بڑھا دیا ہے۔ نظم کی طرف وہ کیسے آئے اور اس میں اپنے جذب وشوق کی دُنیا کو متشکل کرنے کے لیے انھوں نے کن راستوں کا انتخاب کیا اور شعرا کی بھیڑ میں اپنے کن اوصاف کی بدولت وہ نمایاں ہوئے، ان سب پہلوؤں پر تفصیلی کلام کرنے سے پہلے زیادہ مناسب ہے کہ بیسویں صدی میں نظم کے ارتقا پر مختصر بات کی جائے۔ بیسویں صدی کے مجموعی ادبی منظر نامے پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اصنافِ شعری میں نظم کو زیادہ توجہ حاصل رہی ہے اور شعرا کے قافلے دوسری اصناف کے بجائے تواتر اور تسلسل کے ساتھ نظم کے میدان میں اُتر کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں نظم کی طرف اس جھکاؤ کے متعدد اسباب وعوامل ہیں، جن کا ذکر یہاں وہاں اربابِ علم کے ہاں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ نظم کے قبول وفروغ میں جدت کا رنگ سب سے زیادہ شعرا کی توجہ کو اپنے طرف مائل کرنے کا سبب رہا ہے۔ نئی شعری صنف کو کسی دوسرے سماج میں اپنی جڑیں پیوست کرنے کے لیے جس ہمہ رنگی کا اظہار کرنا ہوتا ہے وہ یہاں کی فضا سے ہم آہنگ ہونے کے لیے نظم کو بھی کرنا پڑا۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی سے آغاز ہونے والا نظم کا سفر بیسویں صدی میں جن جن راستوں سے گزرا اور جہاں جہاں اُس نے پڑاؤ ڈالا، اس کا مطالعہ دل چسپی اور دل کشی سے خالی نہیں۔ سیدھی سادی بیانیہ نظموں کے قالب میں نقش ونگار کی کہکشاں اُتارنے کے لیے تخلیق کاروں کو دیدہ ودل کی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اس کے ظاہری پیکر کی تراش خراش اور باطنی ہیئت کے رنگا رنگ تجربوں نے نظم کے سپاٹ، بے رنگ، بے رس اور بے اثر اظہار کو شادابی کے نئے ذائقوں سے روشناس کرایا اور جذبے کا وفور، احساس کی ہمہ گیریت اور فکر کی تازگی نے اس کو نئے سماج میں قدم جمانے کا موقع عطا کیا۔

* صدرِ شعبۂ اُردو، علّامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

نظم کے قالب کو فکر و فن کی نہایتوں سے روشناس کرنے کے لیے سب سے اہم اور فعال کردار اقبال نے ادا کیا۔ علامہ اقبال نے صحیح معنوں میں نظم کے دامن کو کشادہ کر دیا۔ فکر کی گہرائی، فن کا معجز کارانہ استعمال اور شعریت کا وفور نظم کے قالب میں ڈھلا تو دوسری اصنافِ شعر نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نظم بامِ کمال تک پہنچی اور نئی بشارتوں کے در وا کرنے لگی۔ اقبال کی نظم کی فکری و فنی ہمہ رنگی بعد کے نظم گو شاعروں کے لیے مثال بنی اور انھوں نے اس چشمے سے سیر اب ہو کر نظم کی نئی سمتوں کا سراغ لگانا شروع کر دیا۔ بیسویں صدی کے ادب بالخصوص نظم پر اقبال کے دُور رس اور دیر پا اثرات مرتب ہوئے اور مختلف فکری مکتبوں سے تعلق رکھنے والے تخلیق کاروں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال سے اکتساب کیا۔ عہدِ اقبال میں رومانیت کا رنگ نئے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس فضا میں اختر شیرانی، عظمت اللہ خان، حفیظ جالندھری، خوشی محمد ناظر، ساغر نظامی، احسان دانش، جوش ملیح آبادی اور دوسرے نظم گو شاعروں کو پنپنے اور نمایاں ہونے کا موقع ملا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد بھی نظم ہی وسیلۂ اظہار قرار پائی۔ غزل کی ریزہ خیالی، ایمائی اور رمزیہ انداز، ہیئتی پابندی، قافیے کی جکڑ بندی، مخصوص رموز و علائم اور لفظیات کی محدودیت نئے ذہنوں میں سوالیہ نشان بنی رہی اور مغربی پیمانوں سے اس کی جانچ پرکھ کا عمل جاری رہا۔ وہ صنف جس نے اُردو شاعری کی دو تین صدیوں پر حکمرانی کی تھی، ہدفِ تحقیر اور نشانۂ ملامت بن کر گردن زدنی قرار پائی۔ جدید ذہنوں کو نظم کی کشادہ دامانی اور اظہار و بیان کے نئے قرینوں نے اپنے سحر میں لے لیا۔ ساحر، جذبی، اختر الایمان، علی سردار جعفری،، مجاز، ایم ڈی تاثیر، فیض، مجروح، سجاد ظہیر، ظہیر کاشمیری، ندیم، قتیل اور دوسرے نئے لکھنے والے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ادبی منظر نامے کا حصّہ بنے۔ اگرچہ ان میں سے بعض شعرا نے غزل اور دوسرے شعری پیمانوں میں بھی لکھا مگر ان کا بیش تر تخلیقی سرمایہ نظم کی صورت میں سامنے آیا۔ ان شعرا کی ابتدا رومانیت کے زیرِ سایہ ہوئی مگر بہت جلد یہ حقیقت نگاری کی طرف آ گئے اور بھوک، قحط، ناانصافی، سماجی گھٹن، جبریت، استحصال، غلامی، مذہبی جکڑ، عدم مساوات اور دوسرے شخصی یا اجتماعی مسائل جیسے موضوعات پر تسلسل و تواتر کے ساتھ لکھ کر معاصر ادبی منظر نامے کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ ترقی پسند شعرا کی نظم مقصدیت کی آئینہ دار اور پُر جوش اظہار اور خطیبانہ بلند آہنگی کی مظہر ہے۔ اگرچہ فیض اور بعض دیگر شعرا کے ہاں نرمی اور دھیما پن کہیں کہیں اپنی نمود کرتا ہے مگر مجموعی ترقی پسند نظم دھیمے پن کو قبول نہیں کرتی۔ ترقی پسند نظم کی بلند آہنگی اور گھن گرج اسے انقلابی مزاج عطا کرتی ہے۔

ترقی پسند شعرا نے ابھی سفر آغاز کیا ہی تھا کہ شعرا کی ایک نئی کھیپ نظم کے نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ ادب کے منظر نامے پر ابھری۔ یہ شعرا حلقۂ اربابِ ذوق کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور رومانویت اور حقیقت کے مانوس

اور مستعمل رنگوں کے بجائے زندگی کے نئے تصورات اور خیالات کو نظم میں پیش کرنے لگے۔ شروع شروع میں اُن کے موضوعاتِ نظم پر ترقی پسند شاعروں کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے مگر رفتہ رفتہ یہ اثر کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گیا۔ عالمی صورتِ حال نے شعر وادب کی سمت ورفتار پر جو اثرات مرتب کیے، ہندوستان میں ان کا اولین اظہار ہمیں انھی شاعروں کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ معاشی اور اقتصادی دباؤ، عالم گیر جنگوں کی دہشت ووحشت اور فنا ہونے کا احساس نئی شاعری میں نئی ہیئتوں اور پیمانوں میں اظہار پانے لگا۔ مغرب میں اس کے قبولِ عام نے اسے پورے عالم کے لیے نئی چیز بنا دیا اور دوسرے ممالک اور زبانوں کے شعرا ان نئے موضوعات، ہیئتوں اور نئی فنی صورتوں کو اپنے ہاں رواج دینے لگے۔ تصدق حسین خالد، میراجی اور ن م راشد کی ابتدائی تخلیقات پر مغرب کا یہ رنگ اور اثر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جنس اور نفسیات کی نئی تعبیروں اور تصورات نے نئی نظم کو موضوعات کے نئے جہانوں سے متعارف کرایا۔ نفسیات اور جنس کے مسائل اُسی شدت اور تواتر کے ساتھ نظم میں نمایاں ہونے لگے جیسا کہ کچھ عرصہ پہلے بھوک، افلاس اور سماجی ناانصافی کے مسائل کو ترقی پسند شعرا نے ادب میں متعارف کرانے کی کوشش کی تھی۔

تقسیمِ ہند کے وقت اُردو نظم کے شعرا انھی تین بڑے دھاروں میں منقسم تھے۔ رومانی شعرا اور کسی حد تک ترقی پسند شعرا کو نظم کے ظاہری قالب اور پیکر سے کوئی مسئلہ نہ تھا اور بیش تر شعرا پرانی اور روایتی ہیئتوں کو استعمال کر رہے تھے۔ یہ شعرا وزن اور قافیے سے بھی زیادہ پریشان نہ تھے اس لیے ان کے ہاں مقفیٰ اور پابند نظموں کا چلن عام ہے۔ تیسرا گروہ جو زندگی کی نئی معنویت کے تصور کا علم بردار تھا، وہ نظم کی پرانی ہیئت اور ہیئتی پابندیوں کا شدید مخالف تھا۔ قافیہ اور وزن کو وہ خیال کی ترسیل میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا اور یوں اس گروہ سے وابستہ شعرا نے نظم کو نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ نئے پیکروں اور ہیئتوں سے بھی متعارف کرایا۔ خالد، راشد اور دوسرے شعرا نے ابتدا میں سانیٹ اور معرا نظمیں لکھیں مگر بہت جلد وہ ان پیکروں سے بھی دُور ہوتے چلے گئے اور نظمِ آزاد ہی سے اپنا رشتہ استوار کر لیا۔ نظمِ آزاد چوں کہ وزن کی جکڑ بندی سے بھی آزاد تھی اور قافیے سے بھی، اس لیے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ صحیح معنوں میں اس پیکر یا ہیئت کو حلقۂ اربابِ ذوق سے ابھرنے والے انھی نئے شعرا نے معروف اور مقبول بنایا۔ اس کے قبولِ عام کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند اور رومانویت کے علم بردار شاعروں نے بھی روایتی نظمیہ پیکروں کو چھوڑ کر آزاد نظم کو اپنا لیا۔ ساٹھ کی دہائی تک نظم کے یہ تینوں دھارے متوازی بہتے چلے آئے۔

ساٹھ کی دہائی اُردو نظم کے لیے نئے تجربات کی نوید لیے کھڑی تھی۔ نئی نظم اور لسانی تشکیلات کے ناموں سے آغاز ہونے والے تجرباتی سفر کے بنیاد گزاروں میں افتخار جالب اور جیلانی کامران کے نام سرِ فہرست ہیں۔ یہ دونوں نظم کے شاعر تھے اور روایتی زبان اور قواعد کی جکڑ بندی سے جدید نظم کو آزاد کرنے کی دھن میں جوش و جذبے کے ساتھ منظر نامے پر ابھرے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ زبان زندگی کی لایعنیت اور بے معنویت کی مؤثر ترسیل میں ناکام ہے۔ نئی نظم کے ان پُرجوش مبلغین کے نظریاتی اختلاف نے انھیں بہت دُور تک ساتھ نہیں چلنے دیا۔ دونوں الگ ہو گئے مگر اپنے نئی نظم کے تصور کو فروغ دینے کی کوشش جاری رکھی۔ افتخار جالب کے زیرِ اثر نظم کے تازہ کار تخلیق کار ان کے تصور سے بڑی حد تک وابستہ ہو گئے۔ ان تازہ کاروں میں محمد سلیم الرحمان، اختر احسن، انیس ناگی، عباس اطہر، تبسم کاشمیری، سعادت سعید اور عبدالرشید کے نام زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ شعرا یورپ میں مصوری، شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے نئے وجود میں آنے والے تصورات اور تحریکات سے حد درجہ متاثر تھے۔ وجودیت کا فلسفہ ان کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور معاشرے میں فرد کی اہمیت ان کا مطمحِ نظر تھا۔ ان شاعروں نے نئی نظم کے لیے نئے انداز اور اسالیب کو اپنایا۔ علامت، اشاریت، ابہام اور زبان کی خام اور ناتراشیدہ صورتوں کو انھوں نے نظم کی تشکیل میں برتا مگر یہ سلسلہ جس شد و مد کے ساتھ آغاز ہوا تھا، وہ بہت جلد اپنے انجام کو پہنچا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد افتخار جالب نظم گوئی سے دست کش ہو گئے اور ان کے پیروکار بھی پس منظر میں چلے گئے۔ البتہ کچھ نظم نگاروں نے اپنے اسلوب و انداز کو بدل کر تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا۔ جیلانی کامران نئی نظم کو فکری طور پر اسلامی عجمی روایت کے ساتھ جوڑنے کے خواہاں اور آرزو مند تھے۔ خود ان کی بعض نظموں میں یہ رنگ پورے آداب کے ساتھ اُترا مگر نئی نظم کے شاعروں کو وہ اپنی راہ پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سارے عرصے میں نظم کے منظر نامے پر کچھ ایسے شاعر ابھر کر سامنے آئے جن کا نہ تو کسی تحریک سے راست تعلق تھا اور نہ انھیں نئی لسانی تشکیلات سے کچھ سروکار تھا۔ ان شاعروں نے اپنے تئیں نظم کے فکری اور فنی رنگ کو نئی حسیت کے ساتھ تبدیل بھی کیا اور اس میں اضافے بھی کیے مگر کسی تحریک کا آلہ کار نہ بن سکے۔ ان خوش نہاد نظم نگاروں میں مجید امجد، جعفر طاہر، منیر نیازی اور اختر حسین جعفری کے اسما خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ نظم کے ان سربلند شاعروں کے ہاں لسانی تشکیلات کا جوش و خروش بارپا سکا نہ جدید یورپی نظریات و تصورات کی چکاچوند۔

احسان اکبر نئی لسانی تشکیلات اور نظم کے تجرباتی عہد میں منظرِ ادب پر جلوہ گر ہوئے۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش کے ادبی منظر نامے کو ایک گہری نظر سے دیکھا، نئے تصورات کی چکاچوند اور نئے اسالیب کے شور و غلغلہ سے واقف ہوئے۔ تحریکوں کے جوش و خروش اور بلند بانگ دعوؤں کو سُنا مگر کوئی رنگ انھیں اپنا ہم خیال نہ بنا

سکا۔ احسان اکبر کی شخصیت میں غزل کا مزاج گندھا ہوا تھا مگر وہ نظم کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے، اس کا سبب کیا تھا؛ خود انھی کی زبانی سُنیے:

> ۵۰ کی دہائی کا زمانہ (جب سے میں نظم لکھ رہا ہوں) غزل میں وہ بڑے اظہار سامنے نہیں لا سکا تھا، جو اس صنف کو بعد میں نصیب ہوئے۔ میں اُس زمانے کی غزل کے اس رویّے سے مطمئن نہیں تھا کہ مصرعِ اولیٰ میں ایک دعویٰ کر کے دوسرے مصرعے میں محض اُس کے مناسبات لے آئیں یا اس دعویٰ کی توضیح کرنے کو کافی سمجھ لیا جائے۔ مجھے یہ طریقِ شعر گوئی متاثر نہ کر تا کیوں کہ اس طرزِ عمل سے غزل کا شعر اپنے نصف حصّہ کو نئی بات کرنے سے محروم کر دیتا تھا۔ سو اولاً نظم نگاری کی طرف رجوع اسی حوالے سے ہوا۔ پھر وہ بڑے سوالات درپیش ہوئے ____ سو نظم جاری رہی۔ میرے لیے غزل میں ناصر کاظمی کی یادِ ماضی کے مقابلے پر مجید امجد اور منیر نیازی کے خواب فردا کچھ زیادہ مؤثر رہے، سو میں بھی قدم سے قدم ملائے چلتا رہا۔[1]

وہ بڑے سوالات کیا تھے جو احسان اکبر کو غزل اور دوسری اصناف کے مقابلے میں نظم کے قریب لانے کا سبب بنے؛ ان کا ذکر احسان اکبر کے ہاں نہایت وضاحت اور صراحت سے ملتا ہے۔ ''ان طویل نظموں کی تخلیق کا موجب وہی طول طویل مسائل ہیں جو ارضِ مشرق اور عالمی امن دونوں کے درپے ہیں۔''[2] وہ تاریخی، تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی بحران جس نے پورے عالم کو بالعموم اور امتِ مسلمہ کو بالخصوص شکستہ کر رکھا ہے، وہ احسان اکبر کی بے قراری اور نم ناکی کا محرکِ اوّل ہے۔ تاریخ اور تہذیب سے کٹے ہوئے اور بڑی حد تک غافل قارئین کو اس تہذیبی اور سیاسی بحران کے اسباب و عوامل سے روشناس کرنے کے لیے وضاحت اور صراحت کی ضرورت تھی، جو غزل کے ایجاز و اختصار میں نہیں سما سکتی تھی، اس لیے نظم کا قالب دامن کشِ توجہ ہوا۔ روزنامہ اوصاف کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں وہ فرماتے ہیں:

> جو باتیں میں کہنا چاہتا تھا، ان کا تہذیبی پس منظر تھا اور اس کی تاریخی بنیادیں تھیں۔ مجھے بات پوری کرنا تھی جو علامتوں اور اشاروں میں کر سکتا تھا، میں نے غزل بھی کہی مگر جب آوے کا آوا بگڑا ہو تو سارا کچھ سامنے لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں کسی حکمران کی طرح محض یہ الفاظ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتا تھا، چیزوں کو ان کی ممکنہ صورتوں میں دکھانے کی

کوشش کرتا ہوں، بعض اوقات ترتیب سے امیجز لانے ہوتے ہیں، تسلسل سے بات کرنی ہوتی ہے، اس لیے نظم مجھے زیادہ مناسب لگی۔[۳]

احسان اکبر نے جب اپنے ارد گرد بڑھتے ہوئے تہذیبی اور سماجی بحران اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شکستگی کو لفظوں کے قالب میں ڈھالنے کا سفر شروع کیا، اُس وقت معاصر اُردو ادبی منظر نامے پر کئی ترقی پسند اور جدید نظم کے داعی نظم گو دادِ سخن دے رہے تھے۔ ان شعرا کا مطمحِ نظر بھی انسان کو جبر اور دہشت کی فضا سے نکالنا اور اسے زندگی کے منظر نامے پر پوری آزادی کے ساتھ ابھرنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ یہ شعرا بھی سماجی ناانصافی، طبقاتی تقسیم، نفرت، جھوٹ، سماجی روّیوں اور عصری مسائل کے خلاف بر سرِ پیکار تھے اور امن و آشتی اور مساوات کی بات کو بڑھاوا دے رہے تھے مگر احسان اکبر اس موضوعاتی اشتراک کے باوجود ان دونوں تحریکوں سے ایک فاصلے پر رہے۔ وہ اپنے معاصر شعرا کے دکھوں سے اپنے دکھوں کو کہیں زیادہ بسیط اور شدید خیال کرتے تھے اور معاصر نظم کے مروجہ اسالیب میں بات کرنے میں انھیں دشواری محسوس ہوتی تھی۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ انھوں نے ان دونوں تحریکوں سے جُڑے شعرا سے کسی نہ کسی طرح کا اثر قبول کیا اور ان کے موضوعات و اسالیب سے کہیں کہیں استفادہ کیا مگر نظم اور اس کے سانچے کی تراش خراش اور اسلوب کا رنگ و آہنگ اُن کا اپنا ہے۔ ہوا سے بات کے مقدمے میں ضیا جالندھری نے معاصر تحریکوں سے اُن کے نامطمئن ہونے کا ذکر کچھ اس ڈھب سے کیا ہے کہ احسان اکبر کی نظم کا قامت پوری طرح دکھائی دینے لگا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> احسان اکبر ادیبوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو ان دونوں بڑی ادبی تحریکوں (ترقی پسند ادب اور جدید ادب) سے مطمئن نہیں۔ اُن کی ذہنی نشوونما میں اس دو قومی نظریے کی بہت اہمیت ہے جو پاکستان کے قیام کا سبب بنا۔ انھیں اپنی زمین اور اپنی روایات سے شدت کا لگاؤ ہے۔ ان کے خیال میں چوں کہ یہ دونوں تحریکیں بنیادی طور پر مغرب سے آئی تھیں؛ یہ ایسا ادب تخلیق کرنے میں مدد و معاون نہیں ہو سکتی تھیں جو مشرقی انسان کی مکمل نمائندگی کر سکے۔ ان کے نزدیک ایک تحریک محض معاشی مساوات کے ذریعے معاشرے میں انقلاب لانا چاہتی ہے تو دوسری انسان کی نفسیاتی الجھنوں سے زندگی کو اِک گورکھ دھندا بنا کے رکھ دیتی ہے _____ ان کی اس کوشش کو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ وہ اپنی بنیادوں کی طرف لوٹنے کی تمنّا لیے ہوئے تھے اور عہدِ حاضر کے ادب اور افکار سے بہرہ ور ہوتے ہوئے بھی اپنی روایت سے رشتہ جوڑنے کے خواہاں تھے۔ احسان اکبر بجا طور پر ان دو

تحریکوں کے وارث ہیں اور ان تحریکوں سے اُن کی شکایتیں کچھ اس نوعیت کی ہیں جیسے: بالغ ہونے پر بچے اپنے والدین کے "پرانے خیالات" سے اختلاف کرتے ہیں۔ احسان اکبر نے زیادہ تر نظمیں لکھی ہیں اور ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ پتا چل جاتا ہے کہ انھوں نے نئے ادب سے اپنی نظموں کی ہیئت اور ساخت متعین کرنے میں کتنی مدد لی ہے۔ یہی حال اُن کے اندازِ بیاں کا ہے۔ علامتیں، تشبیہیں اور امیجز استعمال کرنے میں انھوں نے ان تحریکوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے، یہ ڈھکا چھپا نہیں مگر اس کے باوجود ان تحریکوں کی طرف احسان اکبر کا رویہ اس لیے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جس ولولے کے ساتھ اپنی روایات کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ ان تحریکوں میں کم یاب ہے۔ وہ اپنی قوم کے ماضی سے، اپنی اساطیر سے، اپنی اقدار سے، مشرق کے افکار سے خود کو وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ مغرب سے نامطمئن ہیں کیوں کہ ان کی نظر میں آج کا مغرب صرف مادی اور معاشیاتی معاملوں کے گرد گھومتا ہے اور اس کا ادب مشرقی روح کی تسکین کرنے کا اہل نہیں۔[۴]

ضیا جالندھری کا یہ طویل اقتباس جہاں احسان اکبر کے فکری نظام کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے وہیں ان کی نظم کے اہم تر موضوعات سے بھی ہمیں روشناس کراتا ہے اور اس کی مدد سے موجود و مستعمل شعری قالبوں اور پیکروں سے احسان اکبر کے عدمِ اطمینان کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ اُن کا یہ کہنا بھی صداقت سے خالی نہیں کہ شعوری یا لاشعوری طور پر احسان اکبر نے معاصر ادبی اور فکری تحریکوں سے بہت کچھ کسبِ فیض کیا ہے اور ان کے موضوعات اور اظہار و بیان کے قرینوں میں یہ اکتساب صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ تاہم ان کی اس رائے سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ وہ "بجا طور پر ان دو تحریکوں کے وارث ہیں اور ان تحریکوں سے اُن کی شکایتیں کچھ اس نوعیت کی ہیں جیسے: بالغ ہونے پر بچے اپنے والدین کے "پرانے خیالات" سے اختلاف کرتے ہیں۔" ان تحریکوں سے احسان اکبر کا اختلاف جزوی نہیں بلکہ اصولی اور بنیادی ہے۔ یہ تحریکیں مغربی افکار کی نقیب اور ترجمان ہیں اور ان کا رشتہ کا انسان کی مادی زندگی اور اس کے متعلقات سے ہے۔ انسان کے تہذیبی، دینی، اخلاقی اور روحانی مسائل و معاملات سے انھیں کچھ سروکار نہیں۔ احسان اکبر مشرقی علوم و فنون اور روایات کے وارث اور امین ہیں، جنھیں مغربی فکر زائد المیعاد اور کہنہ خیال کرتے ہوئے یکسر رد کرتی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی شکستہ حالی، مسلمانوں کا باہمی نفاق، اخلاقی و سماجی قدروں کا زوال، تہذیب سے بے گانگی، سیاسی اور معاشرتی منظر نامے سے مسلمانوں کی بے دخلی، مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں، مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور

مسلمانوں کے احتجاج کو دہشت گردی قرار دے کر انھیں اقوامِ عالم میں بے آبرو کرنے کا چلن اور ان سے جُڑے ہوئے تمام موضوعات احسان اکبر کی آنکھوں کو نم ناک اور سینے کو گراں بار رکھتے ہیں اور انھی موضوعات کو انھوں نے اپنی نظموں میں بالخصوص اور دوسرے شعری پیمانوں میں بالعموم بیان کیا ہے۔ پھر یہ کہ احسان اکبر انسان کے محض معاشی، سیاسی اور مادی مسائل اور معاملات سے سروکار نہیں رکھتے بلکہ اس کے روحانی، دینی اور اخلاقی مسائل اور معاملات کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں کیوں کہ اس کے بغیر انسان کی کامل صورت سامنے نہیں آتی۔ کیا ترقی پسند اور حلقۂ اربابِ ذوق یا جدید شاعری کے علم برداروں کے ہاں یہ موضوعات کہیں اخلاص کے ساتھ جگہ پا سکے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نہیں میں ہے تو پھر ان تحریکوں کا وارث احسان اکبر کو ٹھہرانا کیا درست تنقیدی زاویہ ہے؟

ڈاکٹر احسان اکبر کی فکر کے دو مرکزی سرچشمے ہیں: اسلام اور پاکستان۔ ان کی شعری تخلیقات کے جملہ موضوعات انھی سرچشموں سے پھوٹتے ہیں۔ اسلام ان کے نزدیک محض عبادات اور اخلاقی قوانین کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اور مکمل ترین نظامِ حیات کا نام ہے۔ جو زمینوں اور زمانوں کی قید سے ورا ہے اور جس کے پاس ہر طرح کے حالات میں انسانوں کی رہبری اور رہنمائی کا سامان ہے۔ وہ عالمگیر امن کا داعی اور آشتی کا نقیب ہے؛ اس کا پیغام محبت ہے مگر اقوامِ غرب اپنے تعصبات اور کج فہمی کے باعث اس کے خلاف مسلسل اور منظم پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔ احسان اکبر کا اقوامِ مغرب سے مکالمہ اسی تناظر میں ہے کہ وہ اسلام کے حقیقی پیغام کو سمجھے بغیر اس کے خلاف زہر افشانی کر رہے ہیں۔ احسان اکبر مغربی اقوام کے ساتھ ساتھ دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں سے بھی مکالمہ کرتے ہیں جو اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر اسلام کی بدنامی اور رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے زوال اور پستی کا سب سے بڑا سبب اسلام اور اس کے پیغام سے اُن کی دُوری اور بے خبری ہے۔ مسلمانوں کی تفرقہ پسندی اور تکفیر بازی ان کے درمیان فاصلوں کو بڑھا رہی ہے۔ ان کے مخالفین ان کے اسی انتشار اور افتراق سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، انھیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر کے اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرمِ عمل ہیں۔ احسان اکبر کی نظموں میں اتحاد بین المسلمین کا یہی احساس زاویہ بدل بدل کر اجاگر ہوتا ہے۔ پاکستان اور اس کی محبت اُن کا دوسرا فکری سرچشمہ ہے۔ وہ اس زمین کے ٹکڑے کو مثالی فلاحی ریاست کے روپ میں دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ اسلاف کی جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی یہ پہلی نظریاتی مملکت اُن کے خوابوں کی سرزمین اور اُن کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہے۔ اسے لوٹتے کھسوٹتے ہاتھوں کو وہ کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں؟ اس کے خلاف کی جانے والی منصوبہ بندی کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ عالمی طاقتیں اور مخالف قوتیں اس سرزمین کو پارہ پارہ کرنے اور اس کی وحدت کو نقصان پہنچانے کے لیے جس طرح سرگرمِ عمل ہیں، اسے

کیوں کر صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ احسان اکبر کا لہجہ متین اور شائستہ ہے مگر کہیں کہیں جو طنز میں بجھا ہوا اظہار سامنے آتا ہے یا تلخی کا ایک احساس ان کے مصرعوں سے پھوٹتا ہے وہ اسی خوابوں کی سرزمین سے اُن کی والہانہ وابستگی کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر احسان اکبر نے نظم لکھنے کا آغاز پچاس کی دہائی میں کیا۔ ۱۹۵۴-۵۵ء میں انھوں نے ورڈز ورتھ کی کچھ نظموں کا ترجمہ کیا۔ اس زمانے میں ان کی طبع زاد نظموں میں بھی رومانی تصورات کا رنگ نئے عصری رجحانات سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ اس عہد میں حقیقت نگاری، عقلیت پرستی اور دوسرے تقلیدی رجحانات کے علی الرغم سرریلزم، لایعنیت اور تخیل کی طاقت کو تقلید کے بندھنوں کو آزاد کرانے کے تصورات کا چرچا ہو رہا تھا۔ احسان اکبر کی اُس دور کی نظموں پر ان تصورات کی چھاپ نمایاں ہے۔ اُس عہد کی ایک نظم کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

زباں زباں وہ سسکتے ہوئے دکھوں کا دھواں
دلوں میں ٹوٹ بکھرتے کئی ہزار ارماں
مری طرح سرِ صحرا کوئی رُکے تو سہی
جہاں خیال کی راہوں کے جل بجھے ہیں چراغ
مگر کہاں؟
تری الفت کی بارگاہوں میں
کئی چراغ جلائے گئے ، بجھائے گئے
غمِ جہاں کے اسیروں سے کوئی تو کہتا
کہ تیری زلف کی راتوں کی ہی سحر آئی

مگر اس طرز کی نظمیں اشاعت سے بے گانہ رہیں اور وہ رفتہ رفتہ محبت اور حسن کے روایتی اور عصری میلانات سے دامن کش ہوتے گئے اور سرریلزم اور تخیل کی بیکرانی کو بھی انھوں نے تھپک تھپک کر سُلا دیا کیوں کہ انھیں فکری سطح پر جن نئے بحرانوں کا سامنا تھا، اس کے تقاضے کچھ اور تھے۔ احسان اکبر نے اس نئے تخلیقی سفر میں تہذیب، تاریخ اور سیاست کا سرمایہ زادِ سفر میں رکھ لیا اور پھر طویل اور مختصر نظموں کا باطن انھی موضوعات سے چھلکنے لگا۔ اپنے فکری نظام کی بابت اُنھوں نے لکھا:

رہی فکری سطح تو اس ناتے میرا سوال انسان کے بے ساختہ پن اور آزادی کے سوال سے ہے۔
ہمیشہ قوموں پر قوموں کے تسلط اور افراد پر رسومات کے قہر اور طاقت کے جبر کے خلاف

بات کی ہے۔ مار کھانے کی نشانیوں میں مشرق، عورت اور بچہ ضرور آتے ہیں جو اپنی کمزور ترین حالتوں میں میرے سامنے آئے۔[۵]

احسان اکبر کی طویل نظموں کی ابتدا روشنی کے خواب سے ہوتی ہے۔ یہ نظم مبارک احمد اور اختر حسین جعفری سے تحسین پا کر فنون میں شائع ہوئی اور اپنے مندرجات کی تازگی اور فکری و فنی محاسن کے باعث موضوعِ گفتگو بنی۔ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی نے اس نظم کو نادر مرکباتِ لفظی کا ایک جہان قرار دیتے ہوئے تحسین کی:

احسان اکبر کی نظم روشنی کے خواب نادر مرکباتِ لفظی کا ایک جہان ہے۔ ان کے بنائے ہوئے صرف وہ مرکبات جو نظم میں صرف ہوئے، فنی اعتبار سے عہدِ مغول کے سب مرکب آفریں فنکاروں کی تشکیلات سے کہیں زیادہ سادہ، سبک اور قدرتی معلوم ہوں گے۔[۶]

روشنی کے خواب اپنے بھرے پُرے تہذیبی وجود سے غیر اٹوٹ وابستگی کا اظہاریہ ہے اور اس تہذیبی وجود سے پھوٹنے والی غیر معمولی روشنی کو بجھانے کی مذموم کوششوں کے خلاف صدائے احتجاج بھی۔ مشرق و مغرب کی آویزش اور خیر و شر کی کش مکش کے حوالے سے کئی سوال بھی نظم میں اٹھائے گئے ہیں۔ بُجھے حرفوں کے اندر روشنی کی لکیریں زندگی کی حرارت وحدت کا پیام دیتی ہیں اور شاعر کا خوابِ فردا تمام تر رنگوں کے ساتھ ابھرتا دکھائی دیتا ہے:

بُجھے حرفوں کے اندر روشنی کے باب زندہ ہیں
ہمارے خواب زندہ ہیں _____ ہمیں دیکھو
جو لمحوں کو زمانے بخشتے ہیں
آنکھ میں منشور رکھتے ہیں
مگر اے چاند! سب کے چاند!
اپنے خواب کس نگری کے باسی ہیں؟
ہمیں جینے نہیں دیتی
تمنّاؤں کو ساحل یاب کر جانے کی ظالم آرزومندی
تمنّائیں سرِ محفل سُنا جانے کی شہرت گیر کم ظرفی
ہمیں جینے نہ دے گی
ایسے حالوں میں (روشنی کے خواب)

روشنی کے خواب کے بعد ڈاکٹر احسان اکبر کے ہاں طویل نظم کی تخلیق کا سلسلہ ایک تواتر کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے ہوا سے بات کی پچاس نظموں میں کئی نظمیں طویل ہیں۔ ان طویل نظموں میں: شام کا نام سویر، جہان آباد، بات کیا ہو، زوال یافتہ لوگوں کے لیے معذرت، برگ ریزاں اور سورج نہ بجھا دینا (اوّل و دوم) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے دوسرے شعری مجموعے شایگان میں بھی طویل نظموں کی ایک کہکشاں دکھائی دیتی ہے۔ ستارہ استعارہ، کہانی سانس لیتی ہے، بیاباں وقت کا، ناشکست اور پوربو دیش سے آئے مہمان خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ ڈاکٹر احسان اکبر کی کئی طویل نظمیں جیسے: بابِ علی بابا پر خود کلامی، شرقِ اوسط، جو تم کہو، جدائی درمیاں آئی، ستارے سو گئے ہوں گے اور ان کا کہنا ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکیں تاہم ان نظموں میں پھیلا فکر و فن کا جہان کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ڈاکٹر احسان اکبر کی نظم کے وقیع مطالعے کے لیے ان سے رجوع ضروری ہے۔ ان طویل نظموں میں انھوں نے ملی احساس کو جس پھیلاؤ اور فنی سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہماری جدید نظم میں خاصے کی چیز ہے اور اپنے انفرادی رنگ و آہنگ کا حامل ہے۔

شام کا نام سویر مسلمانوں کی تہذیبی اور ملّی تاریخ کے مختلف مناظر کی عکاس ہے۔ اس میں ارضِ وطن کی محبت اور اپنی تہذیبی قدروں سے وابستگی کا رنگ نمایاں ہے۔ شاعر نے مسلمانوں کے تہذیبی مراکز سے پھوٹنے والی روشنی میں صدیوں کا سفر کرتے قافلے کی کامرانی کی کتھا بیان کی ہے۔ مسلمانوں کو تحریکِ آزادی کے لیے جن آزمائشوں اور امتحانوں سے نبرد آزما ہونا پڑا، اس کو استعاروں اور اشاروں میں عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بحر اور لفظیات میں پاکستانی کلچر کی ہمہ رنگی اپنا اظہار کرتی ہے:

سب سے پہلے دن کے رشتے تیرے میرے نام
ایک سے اپنے پندھ مسافر! ہر منزل ہر گام
پہلے دن کے اپنے بندھن، نِت کا اپنا میل
مصر سے شام کو پاؤں پاؤں چل کر پہنچی ریل
بصرہ، موصل، مشہد، قم رستے کے چار پڑاؤ
ایک زمین کھلی لوگوں پر سب آؤ، سب جاؤ
کون سے شہر نے رومی بانٹا، کس نے پیراں پیر
دجلہ، نیل، فرات کا پانی کون کرے زنجیر

(شام کا نام سویر)

اور تھوڑی دیر حیرت کے کئی رنگ جگاتی رمز بھری نظم ہے۔ گاؤں کی زندگی اپنی شکستہ حالی اور اُجاڑ پن کے باوجود آنکھوں میں سجے خوابوں کی لَو کو مدھم نہیں پڑنے دیتی اس کے برعکس شہر کی جگمگاتی فضا خواب و خیال کی دُنیا کو اُجاڑ دیتی ہے اور زندگی کو ایک آزار بنا دیتی ہے۔ گاؤں کی ہنستی بستی زندگی کو چھوڑ کر اپنے خوابوں کے ساتھ شہر آ جانے والا کس اذیت سے دوچار ہوتا ہے، نظم کی چند لائنیں دیکھیے:

کہ صبحیں
گاؤں میں جو بات کہتی تھیں
سحر دم بانگ دیتے مرغ کا رنگیں سخن
اس کا اشارہ تھا
مجھے اب بھی خیال آتا ہے
پکتی فصل کے لمحے
زمیں جن خوشبوؤں کو صرف میں لاتی تھی
اپنے جسم کی کچی مہک سے پھوٹتی تھیں
اور گنجے پیڑ
پت جھڑ میں پرندے جن کے کھو جاتے
مرے ماں باپ کے جیون کا حاصل تھے
وہ پگڈنڈی سے بنتی ٹیڑھی میڑھی راہ
جس سے میں اُلجھتا تھا
وہ میری زندگانی تھی
میں اپنے خواب کا ہے کو اُٹھائے شہر آ نکلا! (اور تھوڑی دُور)

ڈاکٹر احسان اکبر کی نظموں کے موضوعات تاریخ اور ماضی سے جُڑے ہوئے ہیں مگر یہ ماضی محض گزرا ہوا زمانہ نہیں بلکہ یہ لمحۂ موجود بھی ہے اور عہدِ فردا کی تصویریں بھی اس کے وجود میں پیوست ہیں۔ شاعر ملّی اور تہذیبی قدروں کے زوال کا نوحہ گر ہی نہیں، ظلم و جبر کے خلاف صف آرا بھی ہے۔ حالات کی تلخی اور ناہمواری کے باوصف اُس کی آنکھوں میں خواب کی روشنی اس کے رجائی مزاج کا پتا دیتی ہے۔ وہ گرے پڑے اور شکستہ حال لوگوں کی دل جوئی ہی نہیں کرتا بلکہ اُنھیں پھر سے آمادۂ عمل بھی کرتا ہے۔ موضوعات کا یہ تنوع اور رنگی رنگی شاعر کے احساس

اور وجدان کی کسی ایک ہی تار سے بندھی ہوئی ہے۔ یوں سب نظمیں الگ الگ موضوعات کی حامل ہونے کے باوجود ایک نامعلوم سے رشتے میں منسلک ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم، ڈاکٹر احسان اکبر کے اس وصف کی طرف توجّہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عقیدے سے باطنی ربط، انسان کی فطری آزادی کی جستجو، مظلوم اقوام کی جدوجہد، آزادی کی برملا حمایت، جور و جبر، حبس اور گھٹن کے خلاف احتجاج، عورتوں، بچوں اور معاشرے کی خاموش اکثریت کے لیے دردمندی، مشرق کے تہذیبی تشخص کی پاسداری اور انسانی امکان کے بارے میں رجائیت ____ جیسے کتنے ہی موضوعات ہیں جو احسان اکبر کی فکری جہت کا تعین کرتے ہیں لیکن یہ نظمیں اپنی ہیئت کے اعتبار سے موضوعاتی نہیں۔ انھیں اگر فرداً فرداً پڑھا جائے تو یہ نظمیں شاعر کے داخلی تجربے کی کلیّت میں تخلیقی نمو پاتی نظر آتی ہیں۔ ان میں ایسی ہم مرکزیت ہے کہ کثرت میں وحدت کا تاثر دیتی ہیں۔ جیسے کسی آرٹسٹ کے میورل میں سات رنگ باہم جذب ہو کر روشنی بن جائیں۔ وجدان کی ایک لہر یا شعور کی ایک رواں نظموں کو ایسے جوڑتی چلی جاتی ہے کہ واقعاتی تنوع کے باوجود زمانی تسلسل کہیں ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ ماضی کے احیا کی آرزومند یہ نظمیں حیران کن حد تک جدید ہیں اور ہمارے عہد کے طرزِ حسیّت کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں۔[۷]

زوال یافتہ لوگوں کے لیے معذرت ایک طویل نظم ہے جس میں نہایت خوبی کے ساتھ تحریکِ آزادیِ پاکستان کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ زمانوں کے آلام و مصائب کو خندہ جبینی سے جھیلتا اور وقت کے حوادث سے ٹکراتا اولوالعزم اور اخلاص کیش انسانوں کا یہ پُرشوق قافلہ اُس نظریۂ حیات کی حفاظت کرتا چلا آیا ہے جس کے مابعد الطبیعیاتی اور روحانی حوالے عالمِ انسان کے لیے مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ غیروں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے ساتھ ساتھ اپنوں کی بے حسی اور بے گانگی کے کتنے رنگ اس متاعِ گراں مایہ کی وقعت و عظمت کو کم کرنے میں صرف ہوئے مگر قافلۂ حق کے مسافر اس کے نگہداری میں سینہ سپر رہے۔ علامہ محمد اقبال کی فکری رہنمائی اور قائدِ اعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں ہزار رکاوٹوں کے باوجود فرزندانِ حق وہ ارضِ پاک حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، جسے ان کے تہذیبی وجود کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ پاکستان محض زمین کے ایک ٹکڑے کا نام نہیں بلکہ صدیوں پر پھیلی اس تہذیبی جدوجہد کا نام ہے جو اپنے مخصوص اور منفرد رنگ و آہنگ کی حامل ہونے کے سبب مخالفین کی نظروں میں ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر نے مسافرانِ حق کے روز و شب کی

ہمت آفریں تگ و دو اور جرأت مندانہ جدوجہد کی مختلف تصویریں اتنی عمدگی کے ساتھ نظم کے چوکھٹے میں سجائی ہیں، جسے ہنر کی معراج کہا جاسکتا ہے:

کوئی ایک قطرہ لہو کا تھا
کہ بجائے خود جو گُہر ہوا
اسی دردمند کے سر ہوا
جسے اِک طلب کی مسافتیں
جسے ایک دید کی آرزو
شبِ فتنہ گرد کی ہاؤ ہو
کسی عرضِ شوق کا ذوق تھی
یہ جہاں کہ پھیلتا درد ہے
غمِ جاں کے باٹ ملا مجھے
سو جو حرف سوختہ تن ہوا
مرا فن ہوا

یہ جو عطرِ ذاتِ وجود ہے
یہ کشید ہے
کسی خاکِ شوقِ شگفت کی
جسے بادِ ظلم نہاد نے
یونہی چٹکیوں میں اُڑا دیا
یہی رنگ اپنے وطن کا تھا
یہی طور فکرِ سخن کا تھا
ہیں سوال اُن کے لبوں پہ اب
جو کفِ سوال کی احتیاج نہ دیکھتے
کوئی دیکھتا تو نہ پوچھتا

وہ کرشمہ ساز کدھر گیا
کہ جو انتہائے سرور میں
رگِ شاخِ تاک کتر گیا (زوال یافتہ لوگوں کی معذرت)

شاعر نے مسافرانِ حق کے اس قافلے میں شامل اس گروہ بھی بے نقاب کیا ہے جنھیں دُنیائے دوں کی طلب ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہی ہے اور مال و دولت اور منصب وجاہ کی ہوس میں جو اپنی ملت سے غداری کا ارتکاب کر کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے ہیں۔ شاعر نے اہلِ دانش اور صاحبانِ قلم کی مجرمانہ غفلت اور تغافل کیشی کو بھی نشانہ بنایا ہے کہ اپنے آپ کو خیر کا داعی کہنے کے باوجود وہ اہلِ خیر کی سرفروشانہ جدوجہد کے باب میں مہر بہ لب رہے:

تمھیں یاد ہیں وہ حکایتیں
جو ہوا کی لہر پہ نقش تھیں
وہ کہاوتیں
جنھیں رات صبحِ نشور تھی
مرے دردسانحہ گرد میں
وہ جو غم رقیب تھا ذوق کا
یہاں اہلِ ذوق کی بھیڑ میں
کسے اس کا روپ عزیز ہو؟

اُمتِ مسلمہ جن جن مسائل اور مشکلات سے گزر کر اس منزل تک پہنچی، اس کا شاعر کو پورا ادراک ہے اور اس کے راستے میں کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں کی تاریخ سے وہ پوری طرح واقف ہے۔ مسلمانوں کی بے قراری اور بے توقیری اور عالمی منظر نامے پر اُس کی مخالفت شاعر کے روحانی کرب میں اضافہ کرتی ہے اور اس روحانی کرب کا اظہار اس نظم کی سطروں میں گندھا دکھائی دیتا ہے، تاہم لطف کی بات یہ کہ شاعر قنوطیت اور یاسیت کے بجائے رجائیت کا پیغامبر اور نقیب ہے۔ زوال یافتہ لوگوں کے لیے معذرت کے حوالے سے پروفیسر جلیل عالی نے درست کہا ہے کہ احسان اکبر کی تخلیقی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ملتِ اسلامیہ سے اُس کی روحانی وابستگی ہے۔ ان کے الفاظ میں:

> احسان اکبر کو اس بات کا احساس ہے کہ فطرت اور کائنات کی اسراریت سے ربط آشنائی لہو کے اس ایک قطرے ہی کی جلوہ سامانیوں کی دین ہے، جو اس کی تخلیقی اور روحانی شخصیت کا

اصل جوہر ہے۔ اسی حوالے سے زندگی اور کائنات کی جامع ترین تعبیر کی وارث قومِ رسولِ ہاشمی سے روحانی وابستگی اُس کی تخلیقی ذات کا نمایاں وصف ہے اور اپنے تاریخی و ثقافتی رشتوں کی قربت کے اعتبار سے قومِ رسولِ ہاشمی کا پاکستانی تشخص زندہ ترین تجربہ۔ یہی وجہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا یہ قبیلہ اپنے نظریۂ حیات اور تاریخی عوامل کی کشمکش میں جن المیوں سے گزرا اور گزر رہا ہے، اس نظم میں ان کا روحانی کرب پوری شدت سے ظاہر ہوا ہے۔ سچے اور دردمند لوگوں کے خلوص کے باوجود مثبت نتائج کے صورت پذیر نہ ہو سکنے سے شاعر بعض اوقات اداس بھی ہو جاتا ہے اور یہ اداسی تشویش کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔[۸]

نظم کا آخری حصّہ شاعر کے رجائی مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ وہ غیر معمولی اعتماد اور کامل یقین کے ساتھ اپنے تہذیبی وجود کے ساتھ کھڑے دکھائے دیتے ہیں اور اس متاعِ فکر و نظر کو اپنا سرمایۂ حیات قرار دیتے ہیں جسے صدیوں کا اعتبار حاصل ہے۔ کچے پکے فلسفوں اور خام نظریوں پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک چاہے یہ شوقِ فضول ہو شاعر کے نزدیک اس کے ہونے کا اثبات ہے:

یہ کہو کہ شوقِ فضول تھا
مگر اپنا اپنا اصول تھا
وہی انتخاب کا مسئلہ
وہی امتحاں کا سوال ہے
جہاں آج تک ہیں رُکے ہوئے
کئی پچھلے پُور کے قافلے

انھیں امتحان معاف ہو
کہ خود ان کے راستے خواب تھے
کہ پُرانے ان کے نصاب تھے
کہ جو زندگی انھیں لے مری
یہ اسی کے سر پہ عذاب تھے

جہان آباد علامت اور تلازمے کی تکنیک میں لکھی ایک خوب صورت نظم ہے۔اس میں دہلی کی شکست وریخت اور زوال سے اسلام آباد کی تعمیر و تشکیل تک کے سفر کو نہایت ہُنر مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ نظم میں عہدِ رفتہ کے مناظر یک لخت عہدِ موجود کے مناظر میں مدغم ہو جاتے ہیں اور شاعر کا وجدانی کیف صدیوں کے مناظر کو ایک ہی کینوس پر سمیٹ لاتا ہے۔ نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ہوا کا ٹاٹ بدلتی ہے تو موسم راہ لیتے ہیں
عبوری دور کے لمحے
یہ پتّے ہیں
ٹھہرنے میں نہیں آتے
گزرنے میں نہیں آتے
(گزرنا جیسے لمحہ کوچ کرتا ہو)
قدم کی چاپ آتی ہے
جو سانسوں میں بچھی تنہائیاں تک ناپ آتی ہے
ہوا کی سسکیوں کی چغلیاں کھاتے ہوئے پتّے
کسی آواز پر آواز دیتے ہیں (جہان آباد)

پوری نظم اچھوتی علامتوں، دل کش استعاروں اور تمثال کاری کے نادر نمونوں سے لبریز ہے۔ جس فنی ہنر مندی اور چابک دستی سے مختلف تاریخی واقعات اور مناظر کو نظم کے قالب میں ڈھالا گیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شاعر کا یقین حالات کی ناسازگاری میں بھی اُمید کا پرچم تھامے رواں دواں نظر آتا ہے اور خزاں کے آئینے میں اسے بہار کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ خزاں کے لیے شاعر نے جو پیکر تراشی کی ہے وہ دل پذیری کے کئی زاویے روشن کرتی ہے:

خزاں اُمید کی چھدری کرن چھتنار جنگل میں
خزاں اسکول کی بوجھل گھنیری آخری گھنٹی
خزاں بُڑھیا کے سر کے گھاس کی گٹھڑی
خزاں آواز کے بحران میں آہٹ کی بیداری
خزاں پس ماندگاں کو حوصلہ دیتی عزاداری (جہان آباد)

ابتلاؤں، آزمائشوں اور خزاؤں سے مردانہ وار گزرتا یہ قافلۂ شوق بالآخر ایک نئے دارالحکومت کے خوش رنگ منظروں سے بغل گیر ہوتا ہے، راستے کی سختیوں اور تکلیفوں کا بوجھ اور جہان آباد کے دُکھ کی شدّت یہاں آکر کم ہونے لگتی ہے۔ نظم کا یہ آخری حصّہ عجب ڈرامائی کیفیت کا حامل ہے اور زندگی کے اسرار و رموز کی نئی پرتیں سامنے لاتا ہے:

بہار اِک جاگتے سورج کا بیداری بھرا آنگن
بہار ایسے ہے جوں دارالحکومت کا سجیلا پن
کھلی، دو رویہ سڑکیں، گاڑیاں، آسودگی، تن دھن
چنیدہ دستکاری، لطف و حرفت، ذوق و ذہن و فن
'یکے بر سبزہ پا کوبد کہ ہے ہے رنگ می دارد
یکے از گل بوجد آید کہ وہ وہ بوئے یار آید'
کئی فرسنگ ادھر کھلتا ہے لیکن درد کا پرچم
کسی صاحب دلِ ہمدرد کا در ___ فقر کا درپن
خزاں کی سو بہاریں، جس نے دیکھیں وہ دلِ بے غم
کئی دُنیائیں پہلے کے جہان آباد کی اُلجھن
یہاں کچھ کچھ سلجھتی تھی کہ تھے یکرنگ کیف و کم
یہ دُنیا یا کہ وہ دُنیا؟ نیا پن یا پُرانا پن
خزاں کے راستوں سے جو بھی ماضی کا رہا بندھن
جہاں تھے منتشر پتّے، جہاں تھا بے چراغ آنگن
وہاں تہہ دار کتنا تھا فراقِ یار کا عالم!
مگر اس نور پور شاہاں کو جاتی ہے کہاں ویگن! (جہان آباد)

جہان آباد فکری اور فنی ہر دو زاویوں سے ایک بڑی نظم ہے اور شاعر کے تہذیبی، ملّی اور سیاسی نظریات کو نہایت عمدگی کے ساتھ اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ دہلی کے زوال کا احساس مسلمانانِ برعظیم پاک و ہند کو ایک نیا ولولہ عطا کرتا ہے۔ یہی ولولہ انھیں قید و بند کی صعوبتوں میں ثابت قدم رکھتا ہے اور جبر و استبداد کی فضا اُن

کے جذبے کو مہمیز کرتی ہے۔ قافلۂ شوق کی اس داستان کے کتنے ہی مناظر اس نظم میں جلوہ گر ہیں۔ اس نظم کے فکری اور فنی زاویوں کی انفرادیت کے حوالے سے آفتاب اقبال شمیم لکھتے ہیں:

> احسان اکبر کی نظم جہان آباد کی آخر سطر 'مگر اس نور پور شاہاں کو جاتی ہے کہاں ویگن' مجید امجد کی مشہور نظم نو نمبر بس کی یاد دلاتی ہے، دونوں نظموں کی تکنیک ایک سی ہے۔ انسانی زندگی کے کسی گھمبیر مسئلے پر ایک بے ساختہ خود کلامی اور آخری مصرعے میں لمحۂ حال کے اینٹی کلائمکس پر نظم کا اچانک خاتمہ لیکن ان دونوں نظموں میں متن اور نقطۂ نظر کا فرق بہر طور نمایاں ہے۔ مجید امجد اپنی نظم میں نام نہاد ارتقائے انسانی کو طنز کا نشانہ بناتا ہے جب کہ احسان اکبر کی نظم جہان آباد ایک تمثیلاتی منظر نامہ مرتب کرتی ہے، جس میں ایک زندہ ماضی کا اشاراتی ذکر اور برف کی گرفت میں آئے حال کی روداد باہم مدغم نظر آتے ہیں۔ شاعر نے ماضی کو حال کے پہلو بہ پہلو رکھتے ہوئے بہار و خزاں کو نئے علامتی معنی دیے ہیں۔[۹]

احسان اکبر کی فکر انگیز طویل نظموں میں سورج نہ بجھا دینا بھی ایک اہم نظم ہے جو دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک تمثیل ہے جو ہوا اور دِیے کی علامتوں کے ذریعے خیر اور شر کی مسلسل آویزش کی کہانی بیان کرتی ہے۔ اخلاقی اور روحانی قدروں کے زوال کا احساس اور اُنھیں پھر سے زندہ کرنے کی آرزو اپنے تمام تر زاویوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ نظم کا حصّہ اوّل ہوا سے شاعر کا مکالمہ ہے اور دوسرے حصّے میں ہوا شاعر کے جواب میں اپنی داستان سُناتی ہے۔ نظم میں ڈرامے کی کیفیت موجود ہے اور عمدہ تمثالوں، استعاروں، علامتوں اور اشاروں سے تاریخ کے کئی اوراق روشن ہو گئے ہیں۔ شاعر ہوا کو چراغوں سے دوستی کرنے کی تاکید و تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے:

چل اب مگر بے مہار مت چل
یہیں کہیں کچھ چراغ جلتے ہیں
جن کی لو نرم چاپ سُن کر بھی کانپ جائے
یہ چاپ رشتوں کے ہم قدم ہے
قدم فرشتوں کے ہم قدم ہے
ہوا! چراغوں سے دوستی کر (سورج نہ بجھا دینا-۱)

شاعر کے جواب میں ہوا اپنی رسائی کے نغمے الاپتی کتنے زمانوں اور کتنی صدیوں کے قصّے سُناتی ہے:

میں اُن جہانوں کو دیکھ آئی
سراغ جن کا کہیں نہیں ہے
وہ بے اماں دشت
ممکناتِ سراب سے ماورا زمیں ہے
میں اُن پہاڑوں کے سر پہ اُتری ہوں
جن کی اونچائی سے زمانے لڑھک گئے ہیں
سفارتیں لانے والے راہوں میں تھک گئے ہیں (سورج نہ بُجھا دینا-۲)

کوئی دابی پور کماد کی ڈاکٹر احسان اکبر کی حد درجہ مقبول نظم ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ یہ نظم علمی وادبی حلقوں میں ڈاکٹر احسان اکبر کے وسیع تر تعارف کا سبب بنی اور اُن کی غیر معمولی شہرت میں اس نظم نے اپنا حصّہ ڈالا۔ اپنے موضوع، لفظیات، تمثالوں، علامتوں، استعاروں اور رنگ وآہنگ کی ندرت اور تازگی کے باعث علمی وادبی حلقوں میں اس نظم کا والہانہ استقبال ہوا اور اسے نہ صرف اپنے وقت کی بہترین تخلیق قرار دیا گیا بلکہ اسے آئندہ زمانوں سے کلام کرنے والی نظم بھی ٹھہرایا گیا۔ منیر نیازی اس نظم کی خوشبو کو اگلی صدی میں پھیلنے کی نویدیوں دیتے ہیں:

> کون جانتا ہے اگلی صدی میں آج کے لکھے گئے ادب میں سے کیا سلامت رہ جائے گا، تاہم جو جو کچھ زندہ رہ جائے گا، اس میں احسان اکبر کی نظم ''کوئی دابی پور کماد کی'' ضرور شامل ہو گی اور یقیناتب بھی اتنی ہی تازہ اور اتنی ہی مقبول۔[۱۰]

منیر نیازی کی اس بات سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر حمید نسیم نے کہا تھا:

> احسان اکبر کی ایک نظم بہت سال ہوئے پڑھی تھی، جس میں پنجابی الفاظ بہت نفاست سے شامل کیے گئے تھے۔ میرا خیال ہے اگر وہ اس لہجے کو نکھاریں تو زندۂ جاوید شاعری کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ میرا ایک احساس ہے جو بہت دن سے میرے اندر کار فرما ہے کہ اکیسویں صدی میں اُردو شاعری کی لفظیات اور اسلوب وہی ہو گا جو احسان اکبر کی مذکورہ بالا نظم کوئی دابی پور کماد کی میں جلوہ گر ہے۔[۱۱]

یہ نظم ڈاکٹر احسان اکبر کے مجموعی فکری نظام سے الگ تھلگ دکھائی دیتی ہے اور اس میں وجدان اور رومان بغل گیر نظر آتے ہیں۔ پنجابی اور ہندی لفظیات کی دل کشی، دیہی مناظر کی ہمہ رنگی، لوک دانش کی سحر

انگیزی، تشبیہات کی ندرت، تمثال کاری کی لطافت اور لوک بحر کی دل آویزی نے نظم کو ایک ایسا شہ پارہ بنا دیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے قبل اُردو نظم اس رنگ و آہنگ اور اسلوب سے بیگانہ تھی:

تُو کس سرما کی چاندنی
گرما کی شِکر دوپہر
تُو صبح میں سویا بالکلا
تُو گاؤں میں پچھلا پہر
ست رنگا خواب فقیر کا
یا بھید بھری دوپہر
اِک پوری نیند کی شانتی
تری کجلے والی لہر

اے سنبھلے جسم کی نازنیں!
کئی عمریں تجھ پر تنگ
تو شبد قدیم کتاب سے
اظہار سے جس کی جنگ
تُو ذات حیات کے ساتھ کی
کیوں نکلی غیر کے سنگ؟
تو سینوں بیچ پدھارتی
کیوں تُو نے اوڑھے رنگ
میں شاعر پچھلے جنم کا
تُو میری پرانی منگ
اب جیون اوڑھ کے آئی تو
سہہ تنہائی کے ڈنگ (کوئی دابی پور کمادکی)

اس نظم کے فنی اور فکری زاویوں کے حسن و جمال اور دھمال ڈالتی لفظیات کی رعنائی کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر آفتاب اقبال شمیم فرماتے ہیں:

> کوئی دابی پور کماد کی وقت اور گرامر کے پیمودہ تین زمانوں سے تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی اور منطق کے عام ضابطوں کو توڑتی ہوئی ایک ایسی خوب صورت نظم ہے، جس کی بڑی جامع تعریف خود شاعر نے اس نظم کے دو مصرعوں میں کر دی ہے۔ ''اے سنبھلے جسم کی نازنیں ۔۔۔ کئی عمریں تجھ پر تنگ'' اس نظم کو بار بار سُننے کے بعد بھی سُننے کی تشنگی رہتی ہے۔ نظم میں ہندی اور پنجابی کے الفاظ کا چناؤ جو ہم سے پہلے کی نسل کے روز مرہ کی لغت میں شامل تھے، مثلاً پور کماد کی، مگھر پوہ، شُبھ ناؤں، منگ۔ کانوں میں رومانٹک ایکو بن کر گونجتے ہیں۔ دوسرے نظم کی بحر قدرے تصرف کے ساتھ ہمارے اس خطے میں، مرزا صاحباں کی جانی پہچانی لوک بحر ہے جو صدیوں سے ہمارے لاشعور میں رچی بسی ہوئی ہے۔ تیسرے اس نظم میں Concrete اور Abstract، Particular اور General کو باہم مدغم کرنے کی جدید تیکنیک برتی گئی ہے اور چوتھے یہ کہ شعری تجربے میں وجدانی تائید کی موجودگی نے اس نظم کو ایسا بے ساختہ بنا دیا ہے کہ دل میں گھلتی چلی جاتی ہے۔ تازہ امیجز، استعارے اور شعریت جیسے عناصر بھی اس نظم کے حُسن کو مزید نکھارتے ہیں اور یہ حسن کچھ ایسا ہی بن گیا ہے جسے کیٹس نے ایک مصرعے میں بیان کیا تھا: A thing of beauty is a joy for ever۔[۱۲]

اس نظم کا فارسی میں ترجمہ پروفیسر انور مسعود نے بڑی مہارت اور خوبی سے کیا ہے اور تمام امیجز کو فارسی میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ جاذبیت اور سرشاری ترجمے کے پیکر میں نہ ڈھل سکی جو نظم میں دھمال ڈالتی ہے۔ ترجمے کا رنگ دیکھیے:

یک بندِ نیشکر کاریدند
یک منزلِ ماہِ پیشینہ
کہ نورِ جاودانش
وقت را پس گذاشتہ
وی را خوش آمدی! بگو

یک بندِ نیشکر کاریدند
کہ بماہِ دی بشگفت
ہر کسی ہمین آرزو داشتہ
بس! بااو حرف زند

ڈاکٹر احسان اکبر کے دوسرے شعری مجموعے شایگان میں بھی طویل نظمیں موجود ہیں مگر ان کی طوالت ہوا سے بات کی طویل نظموں سے بڑی حد تک کم ہے۔ اس مجموعے میں سب سے طویل نظم پوربو دیش سے آئے مہمان ہے۔ اس نظم میں دُکھ کی وہ کہانی اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ دُہرائی گئی ہے جس کے نتیجے میں ۱۶/ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان دونیم ہوا۔ شاعر اپنے مہمانِ عزیز کے سامنے اپنے دل کا حال کھول کر رکھ دیتا ہے۔ دشمنوں کی سازشوں اور اپنوں کی بے وفائیوں کا حال وہ بہتے ہوئے اشکوں کی زبانی بیان کرتا ہے۔ حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی اور ہٹ دھرمی سے پیدا ہونے والی دائمی جدائی پر اُفسردہ ہی نہیں شرمندہ بھی ہے۔ شاعر کا اپنے مہمان سے یہ درد بھرا مکالمہ سُنیے:

آج آئے ہو تو لفظ ملتے نہیں
نذر کیا کیجیے
مہرباں میہماں! ایسے لوگوں میں ہو
حال تک آنے والی روایات میں
جن کی عادات، رسموں، ارادوں، خیالات میں
دردمندی میں، انکار و اثبات میں
یادِ ماضی کے رنگیں طلسمات میں
اب بھی موجود ہو
تم جہاں آئے ہو
مجھ کو معلوم ہے
اس جگہ سے تمھاری زمیں تک سفر
اپنا بن بن کے
اکثر اُنھوں نے کیا

جن کا خود دشمنوں والا کردار تھا
اس جواں سے اگر مل سکو تو ملو
جو فقط سرحدوں کا نگہدار تھا
عام انساں اگر مل سکیں تو کہیں
کس قدر اُن پہ گذری جدائی گراں
اشک اُن کے گئے کس قدر رائیگاں (پوربودیش سے آئے مہمان!)

شایگان کی دوسری طویل نظموں میں کہانی سانس لیتی ہے ،بیاباں وقت کا، اورناشکست خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نظمیں عہدِ موجود کی حالتِ زار کا نوحہ ہیں اور تہذیبی قدروں کی پامالی کے بین ان کے مصرعوں میں گونجتے سُنائی دیتے ہیں۔ شاعر اپنے توانا یقین کے باعث شکستگی کی اس فضا میں بھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتا۔اس کی آنکھوں میں چمکتا ہوا خوابِ فردا حالات کی سختی میں مزید جگمگا اُٹھتا ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر شایگان کی ان نظموں کے متعلق خود لکھتے ہیں:

> شایگان___ میرے ہاں اپنے حال کی پسماندگی اور خوابوں کے انتشار کے باوجود اگر آپ کو تمثالوں، استعاروں اور علامات میں خوش رنگی، روشنی، اُمید مندی کی جھلکیاں دکھاتی ہے تو یہ صرف آتے زمانوں کے بارے میں اُمید بلکہ ان زمانوں پر میرے توانا یقین کے باعث ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نئے زمانوں میں روبکار اجتماعی رویّے اور اس عہد میں برسرِ کار ہمارے نوجوان ارتقا و عمل کی راہوں پر بڑے بڑے اقدام کریں گے۔اس لیے میری نظر میں نور صدیاں بھی ہیں اور نئے آدم کا امکان بھی۔[۳]

ڈاکٹر احسان اکبر کی نظمیں واضح نظریاتی اساس رکھنے کے باوصف واقعات کی کھتونی نہیں بنتیں اور حالات کی راست تصویریں ان کے قالب میں نمود نہیں کرتیں۔ اُنھوں نے اپنے جذب واحساس کی ترسیل کے لیے نظم کے فنی تقاضوں سے کہیں انحراف نہیں کیا۔اُن کی نظم اپنے جلو میں بہت سارے رنگ لے کر چلتی ہے۔ یہ رنگ قاری کو حیران بھی کرتے ہیں اور اس کے ذوقِ تجسس کو بھی ابھارتے ہیں۔اس رنگولی میں فکر واحساس کی رو دوڑتی ہے ۔ نظم ابتدا میں جن ہیولوں اور ناتمام تصویروں کو سامنے لاتی ہے وہ تسلسل کے ساتھ واضح صورت اختیار کرتی چلی جاتی ہیں اور پُرشوق قاری کے دل میں وہی احساس پیدا کر دیتی ہیں جو سینۂ شاعر میں دھمال ڈالتا ہے۔ استعارات، اشارات، تمثالیں، تشبیہیں اور دوسرے اظہاری وسیلے ان تصویروں کی سج دھج میں نئے امکانات جگاتے اور ان میں

حسنِ معنی کا نیا جلوہ بیدار کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ڈاکٹر احسان اکبر کی نظم میں ڈرامے اور کہیں کہیں تمثیل کی تکنیکیں جذب واحساس کی نئی دُنیائیں خلق کرتی ہیں۔ مکالمے کا رنگ اور کرداروں کی تشکیل انتقالِ معنی اور ترسیلِ احساس کے عمل کو مزید موثر بنادیتی ہے۔ محمد حمید شاہد، احسان اکبر کے اس وصفِ خاص کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> سیاسی، سماجی اور نظریاتی میلان رکھنے والے تخلیق کار بالعموم راست بات کرنے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔ انھیں تاہنگ رہتی ہے کہ جو انھیں سوجھ رہا ہوتا ہے، وہ عین مین قاری تک ترسیل ہو جائے۔ ایسے میں جہاں کہیں سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں، وہ کرنے سے نہیں چوکتے جب کہ احسان اکبر فکری اور نظریاتی آدمی ہو کر بھی ایسے سمجھوتوں سے کنی کاٹ کر نکل جاتے ہیں۔ میں نے پوری توجہ سے ان کی نظمیں پڑھی ہیں اور لطف لے لے کر پڑھی ہیں، مجھے یوں لگتا رہا ہے کہ محض موضوع سے جُڑنا کبھی انھیں محبوب نہیں رہا ہے۔ اپنی بات بتانے سے کہیں زیادہ وہ سُجھا دیتے ہیں۔ خیال کی ایک لکیر سی نظم میں چلتی ہے، آگے چل کر کچھ بکھرتی ہے۔ یہ بکھرنا بلا سبب نہیں ہے۔ نظم کے اسی بکھراؤ والے علاقے میں جمالیاتی پیٹرن بنتے ہیں۔ بکھرنا اور پھر سمٹنا اس موہوم سی لکیر کی طرف جو پوری نظم یا پھر یوں کہہ لیں کہ احسان اکبر کی پوری شاعری کو معنوی سطح پر بہم کر رہی ہوتی ہے۔ یہی چلن متن کو معنیاتی انسلاکات فراہم کرتا ہے۔[۱۴]

ڈاکٹر احسان اکبر کے فکر کی بوقلمونی اور ہمہ رنگی اپنے ساتھ اظہار وبیان کے قرینے بھی لے کر آتی ہے۔ اظہار وبیان کے قرینے کہیں بھی شعوری کوشش وکاوش کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ موضوع کے ساتھ یوں پیوست ہوتے ہیں کہ الگ سے دکھائی نہیں دیتے۔ اُن کی نظموں کا سب سے بڑا وصف اُن کا غنائی ماحول ہے۔ یہ غنایت آزاد نظموں میں بھی غزل کی سی دل پذیری اور دل کشی پیدا کرتی ہے۔ شاعر کا شعورِ نغمہ اس غنایت کی تعمیر و تشکیل میں برابر دکھائی دیتا ہے۔ آزاد نظم کے مصرعوں میں داخلی قوافی کا بے ساختہ اور برمحل استعمال اس کے سحر کو دوچند اور تاثیر کو سہ آتشہ بنادیتا ہے۔ یہ قافیہ آرائی کسی شعوری جتن کے نتیجے میں سامنے نہیں آتی بلکہ موضوع کی ایک اہم ضرورت بن کر سامنے آتی ہے اور معنی کی ترسیل میں اپنا حصّہ ادا کرتی ہے۔ لفظیات کا جمالیاتی رنگ وآہنگ، ہم صوت آوازوں کی جھنکار اور مصرعوں میں مناسب وقفوں کا التزام غنایت اور موسیقت کے اس نظام کو مزید دل خوش کن بنادیتا ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر کی نظموں میں غنایت کی اس سحر انگیزی کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

اس شاعری کی سب سے دل رُباصفت ان کا وہ غنائی آہنگ ہے کو کسی جھولنے کی طرح دل کو جھلا دیتا ہے اور جھولنے والے جانتے ہیں کہ اس عمل کے دوران دل اُڑان بھرنے کے ساتھ ساتھ بیٹھ جانے کی کیفیت سے بھی گزرتا ہے۔ احسان اکبر کی شاعری میں بھی یہ دونوں کیفیتیں موجود ہیں۔ نظم کی بنت میں قافیوں کے فن کارانہ استعمال نے ایسی نغمگی بھر دی ہے جو دل کے سوئے ہوئے تاروں میں لرزش پیدا کرتی ہے ____ پابند شاعری کے رسیا آزاد نظم کو قافیے سے محروم ہونے کی بنا پر جس بے لطفی کا طعنہ دیتے ہیں، احسان اکبر کی نظم میں اس کا شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی نظموں کا یہ باطنی ردھم نہ صرف انھیں غنائیت عطا کرتا ہے بلکہ ان کے معنوی تاثر کو بھی شدت اور وسعت عطا کرتا ہے۔ احسان اکبر نے بڑی فن کاری سے قافیہ بندی کر کے اپنے مفاہیم کے مختلف شیڈز کو اجاگر کیا ہے۔ یہ قافیے محض سمعی تاثر پیدا نہیں کرتی بلکہ نظم کی فکری توانائی کا ماخذ بھی معلوم ہوتے ہیں۔[۱۵]

ڈاکٹر احسان اکبر ایک سچے تخلیق کار کی طرح ہنر کی نمائش اور فنی کرتب بازیوں سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں۔ وہ چونکانے اور اپنی مہارت و قدرت کے مظاہرے کے لیے آرائشی اور زیبائشی عناصر کا استعمال نہیں کرتے بلکہ اُن کے اظہار و بیان کے ذرائع اُن کی قلبی واردات سے پھوٹتے ہیں۔ یہ صناعانہ عناصر موضوع سے کچھ اس طرح آمیختہ ہوتے ہیں کہ موضوع سے الگ کرنے سے اُن کی طلسماتی کیفیت دم توڑنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر کے اسلوب میں گندھے ان آرائشی عناصر کی خوبی و لطافت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر جلیل عالی فرماتے ہیں:

ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے باوجود ہنر کاریوں کا شعوری و خصوصی مظاہرہ احسان اکبر کا مسئلہ نہیں ہے۔ یوں بھی نمائشی ہنر کاری پڑھنے اور سُننے والے پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتی۔ فنی کاریگری کو ایک مناسب حد سے زیادہ اہمیت دینے والے اکثر شاعر اپنا کوئی دل پذیر اسلوب وضع نہیں کر پاتے کیوں کہ اسلوب تو تخلیقی واردات اور شخصیت کی کلیت سے جنم لیتا ہے۔ احسان اکبر ایک اپنی ڈکشن اور اپنا لسانی مزاج رکھتا ہے، اُسے بجا طور پر ایک صاحبِ اسلوب شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ہنر کاریاں اس کے تخلیقی اظہار میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ الگ پڑی ہوئی سجاوٹی اشیا کا تاثر نہیں اُبھارتیں۔ چناں چہ اظہار و بیان کی لطافتیں اس کی شاعری میں جگہ جگہ "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست" کی کیفیت سے دوچار کرتی ہیں۔ اس حوالے سے ہوا سے بات کے صفحات پر لَو دیتی ہوئی خوب صورت تشبیہیں، نادر

استعاروں کی مختلف صورتیں، نئی نئی علامتیں اور دل کش تمثالیں اپنے تاریخی و تہذیبی انسلاکات سے ایک پُراسرار اور حیرت افزا ماحول تشکیلتی ہیں۔[۱۶]

ڈاکٹر احسان اکبر کی اہم ترین نظموں میں امن : خوابِ گیتی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی یہ طویل نظم تیرہ ہزار سے زائد مصرعوں پر پھیلی ہوئی ہے، اس لحاظ سے اسے اُردو کی طویل ترین نظم ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہ نظم ڈاکٹر احسان اکبر کے کئی برسوں کے غور و فکر، محنت و ممارست اور سعی و کاوش کا حاصل ہے۔ ابتدا میں یہ نظم ابھی سورج نہیں ڈوبا کے عنوان سے معروف ہوئی اور اس کے بعض اجزا اسی عنوان سے مختلف محافل میں پڑھے اور مختلف رسائل میں شائع ہوئے مگر مسلسل غور و فکر کے نتیجے میں اس نظم کو شاعر نے امن : خوابِ گیتی کا عنوان دیا جو اپنے موضوع کو زیادہ عمدگی اور وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر نے ۱۹۸۷ء میں وزارتِ اعلام، عراق کے زیرِ اہتمام منعقدہ عالمی مشاعرے مربد الشعر الثامن میں اپنی اس طویل نظم کے تین سو مصرعوں کا انگریزی ترجمہ پیش کیا، جسے اسلامی دُنیا سے تعلق رکھنے والے چنیدہ شعرا، ادبا اور اہلِ دانش نے پسند کیا۔ یہ قلم برداشتہ ترجمہ خود ڈاکٹر احسان اکبر نے محض ایک رات میں مکمل کیا تھا۔ ڈاکٹر احسان اکبر کی یہ طویل نظم ہنوز کتابی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوئی تاہم تیرہ اقساط میں یہ پوری نظم محمود شام کے معروف علمی و ادبی جریدے ماہنامہ اطراف میں شائع ہو چکی ہے۔ نظم کی اہمیت اور قدر و قیمت کے حوالے سے محمود شام لکھتے ہیں:

> یہ نظم ایک طرح سے اسلام کی تاریخ بھی ہے۔ اسلام کی عظمت اور دوسری تہذیبوں اور مذاہب کے درمیان کشمکش کی روداد بھی۔ انسانی تمدن کی مبسوط اور مدلل داستان بھی ہے۔ جناب احسان اکبر دردمند پاکستانی ہیں، سچے مسلم ہیں بلکہ اقبال کے مردِ مومن ہیں۔ غیر مسلم مؤرخین، مستشرقین اور محققین نے اسلام کی تاریخ کو جس طرح مسخ کیا ہے، احسان اکبر صاحب نے ان ساری کاوشوں اور سازشوں کو اس نظم میں بے نقاب کیا ہے۔ تاریخ، تہذیب اور اخلاقیات کے تناظر میں دلیلوں کے ساتھ رد بھی کیا ہے۔ احسان اکبر صاحب کی یہ نظم شاہکار ہے اور ہمیشہ اُردو زبان کے ماتھے کا جھومر رہے گی۔[۱۷]

یہ نظم مغرب یا استعماری طاقتوں سے ایک مکالمہ بھی ہے اور انسانی تاریخ کی روداد بھی۔ امن چوں کہ انسانی آبادیوں کی بنیادی ضرورت ہے اور انسانی خواہش بھی۔ اس لیے خلقِ خدا ہمیشہ امن کے نام پر استحصال اور ظلم کا شکار ہوتی رہی ہے۔ حکمرانی کے نشّے اور وسائلِ حیات پر مکمل قبضے کی خواہش نے ہمیشہ انسانی آبادیوں کی اس بنیادی

ضرورت اور انسانوں کی اس معصوم خواہش کا گلہ گھونٹنے کا کام کیا ہے اور امن کے نام پر جنگ وجدال اور قتل وغارت گری کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں کو رواج دیا ہے۔ مختلف مذاہب نے اگرچہ امن وآشتی کی تلقین کی اور نفرت کے بجائے محبت کا درس دیا مگر مذاہب کی تعلیمات کے شارحین اور مفسرین نے من مانی تعبیریں اور تاویلیں کر کے اپنی بالادستی کو قائم رکھنے کا جتن کیا۔ ڈاکٹر احسان اکبر نے اپنی اس طویل نظم میں مختلف مذاہب کی مسخ شدہ تعلیمات اور اس کا دفاع کرنے والے گروہوں کے مکر اور شیطنت کا پردہ چاک کیا ہے۔ بدھ مت، عیسائیت، ہندوازم، یہودیت اور دوسرے مذاہب کے نام نہاد پیروکاروں نے امن وآشتی کے نام پر جس بربریت اور سفاکیت کو رواج دینے کا کام کیا ہے، ان پر کڑی تنقید کر کے اُن کے جھوٹے نظریات کا بھانڈا پھوڑا ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر نے دُنیا کے مختلف فلسفیوں، عالموں اور دانش وروں کے ظاہری طور پر جگمگاتے خیالات اور انسان دوستی کے دل فریب نظریات کے باطن میں چھپی تاریکی، نفرت اور انسان دشمنی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور مسلمانوں کو دہشت گرد اور مفسد کہنے والوں کو اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی دعوت دی ہے۔ حکیم محمد سعید اپنے ایک خط میں اس نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> مجموعی طور پر یہ ایک بہت مفید اور مستحسن ادبی کارنامہ ہے جو ایک طرف ہمارے شعری سرمایہ میں اضافہ ہے تو دوسری طرف عہدِ حاضر کے اہم ترین مسئلہ ''قیامِ امن'' کے سلسلے میں ہمیں مؤثر انداز سے متوجّہ کرتا ہے۔ اس نظم سے اسلام اور اسلامی معاشرت کی حقیقی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے، جس سے مسلمانوں کے خلاف مغرب کے بے بنیاد پروپیگنڈہ کی حقیقت کھل جاتی ہے۔[۱۸]

ڈاکٹر احسان اکبر نے اس طویل نظم میں اپنی مستحکم نظریاتی وابستگی کے باوجود تجزیے اور نتائج کے استخراج میں بڑی حد تک معروضیت کو پیشِ نگاہ رکھا ہے۔ کہیں کہیں اُن کا اندازِ نقد استدلال کے بجائے جذبات سے ہم رنگ ہو جاتا ہے مگر بہت جلد وہ اس کی گرفت سے نکل آتے ہیں اور پھر سے دلیل کا دامن تھام لیتے ہیں۔ اُن کی تنقید میں ایک خاص توازن موجود ہے تاہم کہیں کہیں اس میں تلخی اور تندی کی کیفیت بھی شامل ہو جاتی ہے اور طنز کا رنگ گہرا ہو کر ان کے موقف کو کمزور کر دیتا ہے مگر ایسے مقامات کم کم ہیں اور تناسب اور توازن کا پھیلاؤ نظم کے زیادہ حصوں پر سایہ فگن ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر نے اسلام کے انسانی معاشرے پر اثرات اور مسلمانوں کی غیر معمولی اور ہمہ گیر خدمات کی نشان دہی کرتے وقت بھی جذبات کو پوری طرح قابو میں رکھا ہے اور دلیل کے ساتھ اپنے نقطۂ نگاہ کو منوانے اور پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اُنھوں نے اہلِ مغرب کو دلائل وبراہین سے قائل کرنے کی کوشش کی

ہے کہ اُن کے اہلِ دانش جانب داری کے باعث مسلمانوں کو مفسد اور گنہگار خیال کرتے ہیں اور اُن کے اوصاف وکمالات اور کارناموں کو تسلیم نہ کر کے حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتی ہیں۔ حکیم محمد سعید نے ڈاکٹر احسان اکبر کے متوازن تجزیے کو تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> اس نظم کا موضوع نوعِ انسانی کا بنیادی مسئلہ ''امن'' ہے۔ انسان فطرتاً مل جُل کر رہنے والی مخلوق ہے اور مِل جُل کر رہنے کے کُچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ان تقاضوں کی مطابقت ہی میں مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں مختلف معاشرتی اصول وضع کیے گئے، جن کا مقصد امن وآشتی کو ممکن بنانا تھا۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ تمام ممکنہ کوششوں کے باوجود مکمل امن کا دور دورہ بہت طویل مدت تک کبھی قائم نہ رہ سکا۔ احسان اکبر صاحب نے اس تاریخی حقیقت کا تجزیہ بڑے بھرپور انداز میں کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مختلف معاشروں میں امن کی صورتِ حال کیا رہی ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے ہندو معاشرت، بدھ مت کے نظریات اور مغربی مفکروں کے تصورات پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلامی معاشرے کے خدوخال کو ابھارا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام نے عدل، تحمل اور رواداری کی جو مثالیں قائم کی ہیں، اُنھیں نظر انداز کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ لیکن یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ مغرب کے دانش ور غیر جانب داری کے دعوؤں کے باوجود اسلامی معاشرہ کے مثبت ترین گوشوں پر پردہ ڈال کر مسلمان حکمرانوں پر بے بنیاد الزام لگاتے رہتے ہیں۔[19]

نظم روحِ عصرِ رواں کے ساتھ مکالمے سے آغاز ہوتی ہے۔ شاعر نے عہدِ موجود کے انسانوں کی زندگی کی تباہی اور بربادی کے دل دوز اور سینہ شکن مناظر اور اُن کی جلتی اور مسمار ہوتی بستیوں کی وحشت آفریں تصویریں پیش کر کے ایک چُبھتا ہوا سوال اُٹھایا ہے کہ انسانی ترقی کے راگ الاپنے والوں اور انسانی آزادی کے نعرے بلند کرنے والوں کو ملبے کے ڈھیر میں سسکتے اور ایک ایک سانس کو ترستے انسان دکھائی نہیں دیتے اور غلامی کے بندھنوں میں جکڑے اور بیگار پر پکڑے ہوئے خون پسینہ بہاتے بے کس اور مظلوم لوگ اُن کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے! امن کے جھوٹے دعوے داروں کو وہ دکھاتے ہیں کہ اُن کی ہوسِ ملک وجاہ کس طرح اس آئینہ خانے کو کرچی کرچی کرنے پر تُلی ہوئی ہے، جس کو اولادِ آدم نے صدیوں کی ریاضت اور جدوجہد سے متشکل کیا ہے۔ اقوامِ عالم کو اپنے پنجۂ خونی میں جکڑنے اور اُن کی اقتصادیات پر قبضہ کرنے کی آرزو کس طرح علم، تہذیب اور فن کے اداروں کو بے وقعت بنانے میں سرگرمِ عمل ہے!!

روحِ عصرِ رواں!
تم نے دیکھے ہیں
جلتے مکاں اور جھُلستے بدن
اونچے دیوار و در اور ڈھیر ہوتے ہوئے
ڈھیر ملبے کے
ملبے میں ابنائے آدم کے دھڑ
سانس لینے کو ترسے ہوئے لوگ
ان کے سروں پر کدالوں کی چوٹ
اُن کے منہ ناک مٹی سے دھونسے ہوئے
دفتروں، کارخانوں میں، رستوں میں
ویگن بدلتی ہوئی ممّیاں
صحن آنگن میں کفنائے پیر و جواں
بم کے گرنے سے پہلے کی کل کائنات
اِک موئنجو دڑو
اِک ہڑپّہ سے کچھ باقیات
موت کا پُل جہاں سے جہاں کو ملاتا ہوا
تم نے دیکھا یہ منظر
دھواں ہی دھواں
ایک تہذیب ہوتی ہوئی کرچیاں
آتی نسلوں کے جسموں میں
مائع کے مانند بہتی ہوئی ہڈیاں
کتنی صدیوں سے
آدم کی اولاد نے
کرچیاں جوڑ کر

ایک آئینہ خانہ بنایا
کبھی قطرہ قطرہ
کبھی اِک قدم دو قدم
علم، تہذیب، فن
کتنی نسلوں نے
کتنے زمانوں میں
کتنی زمینوں میں بویا جنھیں
آج انسان کے ہاتھ سے
اُن کو جڑ سے اُکھڑتے ہوئے دیکھنا
کس قدر ظلم ہے
آو مل کر چلیں
دیکھتے ہیں کہاں امن کی آنچ ہے (امن: خوابِ گیتی)

اس کے بعد نظم میں تاریخِ انسانی کے مختلف ادوار باری باری ظہور کرتے ہیں اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے ہاں انسانی معاشرے میں قیامِ امن کے لیے کی گئی کوششوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ ان کوششوں کے باوجود کسی بھی زمانے اور کسی بھی خطے میں انسانی معاشرہ امن و آشتی کا مثالی گہوارہ نہ بن سکا۔ ڈاکٹر احسان اکبر نے اُن کا معروضی انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے اُن کے باطن میں چھپی ہوئی خرابیوں کی نشان دہی کی ہے، جن کی وجہ سے وہ تصورات و نظریات پائیدار امن کے قیام و نفاذ میں ناکام رہے ہیں۔ شاعر دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے کہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو نہ صرف امن کا داعی ہے بلکہ اس کے پاس اس کے وہ پورا نظام موجود ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر انسانی معاشرے کو امن و آشتی کا مثالی گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ امن کا یہی پیغام لے کر مسلمان دُنیا میں نکلے اور مختلف خطوں میں ایسے مثالی معاشروں کی داغ بیل ڈالی، جن کا خواب امن و آشتی کو ترستی مخلوق صدیوں سے دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ مسلمانوں کے جھنڈے جب دُنیا کے مختلف خطوں میں لہرانے لگے تو عیسائیت اور یہودیت کے علمبرداروں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگا۔ اُنھیں اپنا پوری دُنیا پر حکمرانی کا خواب ریزہ ریزہ بکھرتا محسوس ہوا تو وہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر اُتر آئے۔ صلیبی جنگوں سے آغاز ہونے والی اُن کے بغض و عناد اور کدورت و نفرت کی کہانی آج بھی جاری ہے اور مسلمانوں کی قوت کو توڑنے اور اُن کی طاقت کا شیرازہ

بکھیرنے کا کوئی موقع اُنھوں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔اُن کے مسلسل تزویری حملوں، سازشوں اور پرویزی حیلوں نے اُمتِ مسلمہ میں نفاق پیدا کرنے اور اُن کی جمیعت کو پارہ پارہ کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔مسلمان اُن کے دامِ تزویر میں آ کر جادۂ حق سے دُور ہوتے چلے گئے۔یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے اور اُن کی دل آزاری کے لیے کہیں نام نہاد مغربی اہلِ دانش نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ والا صفات اور سیرتِ مطہرہ پر طرح طرح کے اعتراضات کیے، کہیں آپ کی بیہودہ تصویریں اور کارٹون بنائے، کہیں قرآن اور احادیث کے استناد کو چیلنج کیا۔اُن کے تعصب، تنگ نظری اور بغض نے مسلمانوں کی بستیوں اور آبادیوں میں کشت وخون کی ہولی کھیلی۔ فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، افغانستان، عراق، ایران، شام اور دوسری مسلم آبادیاں ان کی بربریت اور سفاکی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔یہ سب کچھ کر کے بھی اُن کے ہاتھ صاف ہیں اور اُن کی نظر میں مسلمان دہشت گرد اور مفسد ہیں۔اُن کا میڈیا اقوامِ عالم کو چیخ چیخ کر اسلام سے ڈرا رہا ہے۔اسلاموفوبیا نے پورے استعماری حلقوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ڈاکٹر احسان اکبر نے اپنی طویل نظم یں مغرب کی اس چوری اور سینہ زوری کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمود شام اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اُردو میں پہلے ایسی لازوال نظم یقیناً نہیں لکھی گئی۔یہ تاریخ کے مختلف روشن تاریک ادوار کا احاطہ کرتی ہے۔سیاسی، سماجی، فکری اور دینی تحریکوں کا ذکر کرتی ہے۔فلسفیوں کے اقوال کا حوالہ دیتی ہے لیکن ایک موجِ تہ نشیں بھی اور ایک غالب جذبہ بھی کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو آتے زمانوں تک کے ماحول، ٹیکنالوجی، شعور، جذبات کے مطابق ہے۔اہلِ مغرب کی اقتصادی کامیابیاں اپنی جگہ مگر روحانی اعتبار سے وہ مایوس ہیں، بے قرار ہیں۔ڈاکٹر احسان اکبر کی یہ نظم صدیوں پر محیط ہے اور یہ آئندہ کئی صدیوں تک زندہ رہے گی۔[۲۰]

نظم کا آخری حصہ ایلیٹ سے مکالمہ ہے جسے امن وآشتی اور شانتی کی طلب ہمیشہ بے قرار رکھتی تھی۔ایلیٹ کی علامتی معنویت پورے مغرب کو محیط ہے۔مغرب جو مریخ ومشتری پر اپنے جھنڈے گاڑنے اور ترقی کے بامِ کمال تک پہنچنے کا دعوے دار ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس کی پیش رفت اور کارگزاری کو تمام اقوام تسلیم کرتی ہیں مگر اس قدر مادی ترقی کے باوجود اس کے معاشرے امن وسکون سے بے گانہ اور اُس کی روح قرار ناآشنا ہے۔مادی وسائل کی بہتات کے باجود اس کے مرد وزن میں انتشار، بے چینی، ہیجان اور بے قراری میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ شاعر مغرب کے اس مضطرب قافلے کو امن وآشتی کے دین کی طرف بُلاتا ہے۔وہی اسلام جس کے ماننے والوں کو اہلِ مغرب اپنے تعصب کے باعث دہشت گرد اور مفسد خیال کرتا ہے۔شاعر نے اہلِ مغرب کی آنکھوں

سے تعصب کی پٹی ہٹانے کا جتن کیا ہے اور دلائل و براہین سے اُس کے مفکرین اور فلسفیوں کے گمراہ کُن خیالات و نظریات کی قلعی کھولی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اسلام ہی وہ واحد فکری سرچشمہ ہے جو مخلوقِ خدا کو امن و آشتی کی گھنی چھاؤں مہیا کر سکتا ہے، اس دُنیا میں بھی اور اگلی دُنیا میں بھی۔ اسلام ہی کے پاس انسانی معاشروں کے لیے پائیدار امن کا نظام موجود ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اسے بجا طور پر اقبالیات کی رجائیت کا تسلسل قرار دیا ہے:

> اس نظم [امن: خوابِ گیتی] میں انھوں نے مشرق و مغرب کے درمیان مکالمے کی جو فضا تیار کی ہے وہ جادۂ ترقی پر بہت پیچھے رہ جانے والی قوموں کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کو خوب اجاگر کرتی ہے۔ اقبال کی رجائیت کے تسلسل میں نظم، اُمید کے تابندہ افق کی سیر پر ختم ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک نوع کی رومانیت ہے جو حال کی تلخ حقیقتوں سے نبرد آزما ہونے کی ایک تکنیک قرار دی جا سکتی ہے۔[۲۱]

ایلیٹ!
اگلی دُنیا تو تسلیم اور شانتی ہی کی ہے
لیکن ان کے لیے ہی فقط
اس جہاں کا عمل جن کو تسلیم کے نام منسوب تھا
امن خیر اور خوبی کا ضامن تھا
وہ اس جہاں سے گزرتے ہوئے
اس طمانیتِ قلب کے ساتھ گزریں گے
گویا رضائے الٰہی کے ہمراہ ہیں
(زندگی بھر وہ چوں کہ رضائے الٰہی پہ راضی تھے)
سو جان کو قبضہ کرتا فرشتہ اُنھیں پہلے تسلیم کرتا ہے
(جینا بحقِ خداوند تسلیم)
آتا جہاں جو ہے اس کا تصور
جہاں کے مذاہب میں
عیسائی، بدھ، ہندو، جین اور یہودی کے ہاں ہے
مگر جن کو اگلے جہاں شانتی اور بخشش کی امید ہے

اس جہاں سے وہ مایوس کیوں؟
زندگی بطنِ ممکن میں
ایسے شگوفے سنبھالے گزرتی چلی جارہی ہے
جنھیں کل بہر حال کھِلنا ہے
اور نافۂ وقت میں
جن کی خوشبو نہ ٹھہرے گی
خود زندگی سے سنبھالے نہ سنبھلے گی
اس خیرِ امکاں کو آواز دو
اس کو آواز دو
اُس کی آواز پر کوئی آواز دو
لبیک۔۔۔لبیک۔۔۔لبیک
ان الحمد والنعمۃ لک والملک
لا شریک لک لبیک
لا مثیل لک لبیک
لا مثال لک (امن: خوابِ گیتی)

ڈاکٹر احسان اکبر کی یہ طویل نظم تکنیکی اور فنی حوالے سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اُنھوں نے سیکڑوں اسمائے معرفہ کو نہایت خوبی اور مہارت کے ساتھ نظم کیا ہے اور مختلف فلسفیوں اور دانش وروں کے اقوال وافکار کو صحت اور وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختلف تاریخی واقعات کی پیش کش میں جزئیات کا بھی خیال رکھا ہے۔ اُن کا یہ کہنا درست ہے کہ "میری طویل نظم ابھی سورج نہیں ڈوبا[امن: خوابِ گیتی]نہ صرف بے شمار اسمائے معرفہ اور اصطلاحاتِ علمی کے ذکر سے بھری پڑی ہے بلکہ طوالت بھی کئی ہزار مصرعوں تک کھنچی ہے مگر نغمگی ایسی ہے کہ اس ساری نظم میں میٹر کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔"[۲۲] تاہم بعض اسما اور انگریزی اصطلاحات و لفظیات کو خود ساختہ تلفظ کے ساتھ ہی میٹر میں پڑھنا ممکن ہے۔ نظم میں کہیں کہیں غیر ضروری طوالت بھی اس کے حسن کو ماند کرنے کا سبب بنتی ہے۔ نظم میں اگرچہ معروضیت کا خیال رکھا گیا ہے تاہم کہیں کہیں

جذباتیت اس توازن کو قائم نہیں رہنے دیتی۔ مجموعی طور پر یہ طویل نظم ڈاکٹر احسان اکبر کی بڑی اور فکر انگیز نظموں میں شامل ہے۔

ہوا سے بات اور شایگان میں شامل طویل اور مختصر نظموں کے علاوہ بھی ڈاکٹر احسان اکبر نے کئی بڑی چھوٹی نظمیں تخلیق کیں، جن میں سے کئی ایک رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکی ہیں مگر کسی مجموعے کی صورت میں اشاعت آشنا نہیں ہوئیں۔ ان نظموں میں بھی احسان اکبر کی فکری متاع اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں اور فنی شعور کے ساتھ موجود ہے۔ اُن کی غیر مدون چنیدہ نظموں میں بابِ علی بابا پر خود کلامی، شرقِ اوسط، جو تم کہو، جدائی درمیاں آئی، ستارے سو گئے ہوں گے، اُن کا کہنا، اے ریگ زار، عراق آشوب اور لامعکوس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں میں بھی مشرق و مغرب کی آویزش، اُمتِ مسلمہ کی پریشاں حالی، مظلوموں کی حالتِ زار، اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی پامالی اور ابنائے وطن کی بے سروسانی جیسے موضوعات فنی سلیقے اور دل کش تکنیکی مہارتوں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر احسان اکبر کی رومانویت اُنھیں ان نامساعد حالات اور شکستہ زمانوں میں بھی ٹوٹنے اور مایوس ہونے سے بچاتی ہے اور اُن کی آنکھوں میں سجا خوابِ فردا کہیں نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اُن کا فنی کمال اور ہمہ رنگ اسلوب اُن کے متن کی ثقاہت اور فکر کی سنجیدگی کو تمام تر رنگوں کے ساتھ قاری کے دل میں اُتار دیتی ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا یہ کہنا درست ہے کہ: ''احسان اکبر کی نظمیں دل کو چھوتی ہیں۔ قلعی گر کا سا فن اُنھوں نے پایا ہے۔ صیقل کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ نظموں کی سطور چمکتی ہوئی جھالروں میں موتیوں کی لڑیوں کی طرح نظر کو خیرہ کرتی ہیں۔''[۲۳]

ڈاکٹر احسان اکبر بلاشبہ جدید اُردو نظم کے اُن باکمال اور ممتاز شاعروں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے اقبال اور ن م راشد کی فکری اور فنی متاع کی ثروت اور رفعت میں اضافہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے فنی اور تکنیکی شعور سے آزاد نظم کی پوشاک کو اس قدر جاذبِ نگاہ اور دامن کشِ دل بنا دیا ہے، جو اپنی مثال آپ ہے۔ اُنھوں نے لفظیات کی خوش رنگی، تراکیب کی رعنائی، تمثال کی طلسم کاری، تشبیہات و استعارات کی ندرت اور جمال آفرینی سے جدید اُردو نظم کی سج دھج میں اضافہ کیا ہے۔ اُن کے فکر و فن کی بو قلمونی کو ڈاکٹر نجیبہ عارف نے یوں خراج پیش کیا ہے:

> احسان اکبر کی شاعری بطونِ ذات سے نکلی ہوئی ایسی ہی سرگوشی ہے، جس میں سرمستی اور بے خودی سے لبریز منظر بے حجابانہ در آئے ہیں۔ وصالِ ذات کے کسی درد انگیز نشاط سے پھوٹتی ہوئی آہ، جس میں ایک دبی ہوئی سسکاری کی لذّت بھی ہے اور ایک فروزاں چنگاری کی حدّت بھی، کربِ آگاہی کی اے اختیار چیخ بھی ہے اور ناموجود کو موجود کر دینے کی ابدی

تڑپ بھی۔ یہ شاعری کسی ایسی وجدانی کیفیت کی مظہر ہے جہاں صریرِ خامہ ہی نہیں، دلِ شاعر بھی نوائے سروش سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور صاحبِ ساز غافل ہو یا ہُشیار، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نوائے سروش کی اپنی ایک دُنیا ہے۔[۲۴]

حوالہ جات:

۱۔ "جواز" مشمولہ: شایگان (اسلام آباد؛ المسطر؛ ۲۰۰۹ء) ۱۵۔
۲۔ ایضاً: ص ۱۴
۳۔ ڈاکٹر احسان اکبر سے مکالمہ: مطبوعہ روزنامہ، اوصاف، اسلام آباد؛ ۱۱/ اکتوبر ۲۰۰۲ء
۴۔ "یہ کفِ دست" مشمولہ: ہوا سے بات (اسلام آباد؛ المسطر اگست، ۲۰۰۲ء) ۸، ۷
۵۔ "باعث آنکہ" مشمولہ: ہوا سے بات: ص ۱۷۵۔
۶۔ بیک فلیپ از ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی؛ ہوا سے بات۔
۷۔ "یہ نظمیں" از آفتاب اقبال شمیم مشمولہ: ہوا سے بات؛ ص ۱۴۔
۸۔ "زوال یافتہ لوگوں کے لیے معذرت: ایک مطالعہ" مشمولہ: نیرنگِ خیال؛ راول پنڈی؛ دسمبر، ۲۰۰۳ء؛ ص ۱۰، ۹۔
۹۔ ہوا سے بات: ایک جائزہ، از آفتاب اقبال شمیم؛ غیر مطبوعہ مضمون۔
۱۰۔ فلیپ مشمولہ: ہوا سے بات۔
۱۱۔ ایضاً
۱۲۔ ہوا سے بات: ایک جائزہ، از آفتاب اقبال شمیم؛ غیر مطبوعہ مضمون۔
۱۳۔ "جواز" مشمولہ: شایگان؛ اسلام آباد؛ المسطر؛ ۲۰۰۹ء؛ ص ۹۔
۱۴۔ محمد حمید شاہد "احسان اکبر کا فن: یہ کرشمہ سوزِ جگر کا ہے" مشمولہ، (تسطیر؛ شمارہ ۶؛ ۲۰۱۸ء) ۲۶۲
۱۵۔ "احسان اکبر کا شعری سفر" مشمولہ: رفتہ و آیندہ (اسلام آباد؛ پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء) ۱۴۹
۱۶۔ "ہوا سے بات کی بازگشت"، مشمولہ: شعری دانش کی دھن میں (راول پنڈی؛ حرف اکادمی؛ اکتوبر، ۲۰۲۰ء) ۲۷۲
۱۷۔ تعارفیہ از محمود شام مشمولہ: ماہ نامہ، اطراف (کراچی؛ جنوری، ۲۰۲۲ء) ۵۵
۱۸۔ حکیم محمد سعید کا مکتوب بنام ڈاکٹر احسان اکبر: ۱۵/ نومبر ۱۹۸۸ء۔
۱۹۔ حکیم محمد سعید کا مکتوب بنام ڈاکٹر احسان اکبر: ۱۵/ نومبر ۱۹۸۸ء۔
۲۰۔ تعارفیہ از محمود شام، ۵۵
۲۱۔ "احسان اکبر کا شعری سفر" مشمولہ: رفتہ و آیندہ، ۴۵-۱۴۴
۲۲۔ "جواز" مشمولہ: شایگان (اسلام آباد؛ المسطر؛ ۲۰۰۹ء) ص ۱۲
۲۳۔ فلیپ از ڈاکٹر ستیہ پال آنند: ہوا سے بات۔
۲۴۔ "احسان اکبر کا شعری سفر" مشمولہ: رفتہ و آیندہ، ۴۵

Abstract

Poetry in general especially in the eastern traditional settings draws a thin line between art and worldly mundane affairs.Its diction often offers a new shade of meaning while dealing with sensuousness is another rich domain of it .Rich in cultural aspects ,Urdu Ghazal may represent a widespread thought but when we say Urdu Nazm ,it requires avid reading, experience and global perspective.This research article discusses the tradition of Urdu Narrative Poem from its very inception in 20th century with quotations from major poets and their seminal works but the main part of this research focuses on the poetic journey, thought pattern,worldview and some unanswered questions of Ahsaan Akbar's poetry.Researcher also critically analyses the socio cultural arena of Urdu poetry in the said article..

Keywords: Urdu Narrative poem, social cultural arena, Ahsaan Akbar, tradition